خرافات

انشائیے

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

مضامین

خرافات

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

اِنتساب

اس سچائی کے نام

جو

بہت کڑوی ہے

اور

نا قابل برداشت ہے

اور

اب

دوسرے روپ میں ڈھل کر

قابل برداشت ہوسکتی ہے

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : خرافات

صنف : مضامین

مصنف : ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

سنہ اشاعت : ۲۰۲۱ء

سرورق : ایس اے شکیل

کمپیوٹر کمپوزنگ : فیاض احمد شیخ کاڈی پورہ

** 7006332185**

طابع : اظہار مبشر (9906663269)

قیمت : Rs.350/-

کتاب ملنے کا پتہ:

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز: اِقبال آباد کے پی روڈ اسلام آباد

مرازادبی سنگم بجبہاڑہ 192124

کتاب گھر لال چوک سرینگر

ویژن کمپیوٹرز کیشنز اسلام آباد جنرل بس اِسٹینڈ

خرافات

خرافات کڑوے سچ اور حقائق کو میٹھے انداز کرنے میں پیش کرنے کی میری ایک کوشش ہے دراصل یہ ''ابوادا'' کے نام سے ایک اردو ہفتہ روزہ اخبار 'سبزار' میں شایع شدہ کالموں اور تحریروں پر مشتمل ہے۔

خرافات کی تحریروں کے پیچھے یہی حقیقت کارفرما تھی کہ ہم اور ہمارا سماج اخلاقی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشتی معاملات میں اخلاقی طور دیوالیہ پن کا شکار ہوا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ہم تباہی کے اس دہانے پر کھڑے ہونگے جہاں سے واپس لوٹنا مشکل ہوگا۔ اسی دیوالیہ پن کی نشاندہی اگر سیدھے الفاظ میں کیجائے تو یہ اندیشہ تھا کہ شاید کچھ لوگ اسکو ناپسند کرینگے۔ مسکراہٹوں کی پھلجڑیوں کے لبادے میں سماجی برائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش ہے جس میں وقتی ہنسی اور دیرپا سوچ کے دروازے کھلنے کی توقعات موجود ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ مزاج کا خوشگوار تاثر اور طنز کی تلخی دیرپا ہے اسی لئے اس صنفِ ادا کا میں نے سہارا لیا ہے۔ تلخ حقائق کو مزاح کی چاشنی سے سجانے اور طنز کو بڑے احتیاط سے

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	پیش لفظ	05	۲۰	ہم نے سُنا تم بھی سُنو!	61
۲	رئیس الحجام	07	۲۱	جھنڈے کا فنڈا	63
۳	میں پتھر باز ہوں لیکن.....	10	۲۲	بنگولے سے مرچ گولے تک	66
۴	سٹیٹس سمبل	13	۲۳	قوم کے غم میں کھاتے ہیں ڈینر	69
۵	یہی سیاست ہے	16	۲۴	جیت گیا عمہ شرمال	72
۶	مسیحا کی تلاش	20	۲۵	اور آوٹ	75
۷	اُستادِ گوسفندان	22	۲۶	یہ رنگ بھی لایا میاں.....	78
۸	حسرت ہے اس حضرت انسان پر	26	۲۷	شاعر اور شاعری	81
۹	شفاخانے سے دواخانے تک	29	۲۸	ہم کسی سے کم نہیں	84
۱۰	ماں کی لوری سے نیند کی گولی تک	33	۲۹	مُتی آب	87
۱۱	عوام کون؟	36	۳۰	شاید کہ اُتر جائے دل میں	89
۱۲	نوکری چاہیئے۔ تنخواہ ملے نہ ملے!	39	۳۱	لاتوں کے بھوت باتوں سے	91
۱۳	اور نیتا بن گئے۔	42	۳۲	عقل پر دُھول	94
۱۴	بازار سجتے ہی لُٹیرے آ گئے	45	۳۳	مداری کا تماشا	97
۱۵	تیرے وعدے پر جیئے ہم	47	۳۴	مجلس خرافات	101
۱۶	دال میں کچھ کالا ہے	49	۳۵	جو کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں	104
۱۷	یہ مسائل تصوف	52	۳۶	اسکو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا	107
۱۸	من السلویٰ	55	۳۷	کونسی بلا	109
۱۹	اَن پڑھ گریجویٹ	58			

رئیس الحجام

ایک بار ایک بادشاہ اپنے حجام کی حجامت سے خوش ہوا اور اُس سے کہا کہ اب وہ رئیس الحجام ہے۔ حجام پھولے نہ سمایا اور جب گھر پہنچا تو اپنی بیوی پر رعب جمانے لگا۔

''میں اب عام حجام نہیں ہوں۔ میں اب رئیس الحجام ہوں''

حجام کی بیوی بڑی عقلمند تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا کہ وہ کیسے رئیس الحجام بن گیا۔ حجام نے فخریہ انداز میں جواب دیا کہ بادشاہِ وقت نے اسکو ''رئیس الحجام'' بنایا۔ حجام کی بیوی ہنس پڑی اور بولی کہ بادشاہ کے کہنے سے وہ تھوڑا رئیس الحجام ہو گیا، وہ تو رئیس الحجام تبھی کہلائے گا جب ملک کے سبھی حجام اُسے اپنا رئیس مانیں گے۔

یہ بات ہمارے ان تمام لیڈروں، دینی اور دنیاوی علماء، ادباء، شعراء اور ایسے ہی دوسرے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ ہر سال پندرہ اگست، چھبیس جنوری اور دیگر ایسی تقریبات پر ایسے ہی بہت سارے حجاموں کو رئیس الحجام کے

استعمال کرنے میں کس حد تک مجھے کامیابی ملی ہے اسکا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ سطروں کے بیچ اور لفظوں کے پیچھے ہمارے عہد کی کڑوی سچائی کو اُجاگر کرنے کی کوشش آپکو پسند آئیگی۔ جن لوگوں نے ان تحریروں کو اخبار کے ذریعہ پڑھا ہے انہوں نے اسکی پذیرائی کی ہے اور توقع ہے کہ اب قارئین اسکو ایک کتابی صورت میں پڑھکر ضرور پسند کرینگے۔ میں مراز ادبی سنگم کے ممبران بالخصوص اظہار مبشر کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ان تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کرنے میں میری حوصلہ افزائی کی۔

۱ر فروری ۲۰۲۱ء

محمد شفیع ایاز

کچھ اور ہے۔ انکی کتابیں پڑھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ انکا معیار کتنا اونچا ہے۔ ورنہ ہمارے یہ رائٹرس کیا واہیات لکھتے ہیں! میں بھی تو ایک قلمکار ہوں لیکن میں مقامی اخباروں یا رسالوں کیلئے نہیں لکھتا ہوں۔'' اسکی باتیں سنکر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ اِسے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ ساتھی بھی رائٹر ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا بھئی وہ کس غیر ملکی اخبار یا رسالے کیلئے لکھتا ہے تو وہ مسکراتے ہوئے بولا ''تمہیں کیا بتاؤں یار'' مجھے تو بہت سے ایوارڈ بھی ملے ہیں، یہ اور بات ہے کہ میں اپنے منہ سے اپنی تعریفیں کرنا نہیں چاہتا''۔ یہ کہکر وہ کھڑا ہو گیا اور دفتر سے باہر نکلا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ لکھتا کیا ہے اور کس اخبار یا رسالے کیلئے لکھتا ہے۔ اور کس زبان میں لکھتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک اسکی تعلیم کا تعلق ہے اس نے کالج گیٹ پر آویزان کالج کے بورڈ کو صرف پڑھا ہے کالج کے اندر قدم نہیں رکھا ہے لیکن تیور ایسے لگ رہے ہیں جیسے کہ اس نے بار ایٹ لا کیا ہے اور اس غلط فہمی میں ہے کہ وہ یہاں کا رئیس الحجام ہے۔

☆☆☆

خطابات اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی یا اخبار میں جب یہ بات آجاتی ہے تو ایسے افراد کے تیور بدل جاتے ہیں۔ اُن کا طرز کلام، اٹھنا بیٹھنا، لباس سب کچھ بدل جاتا ہے۔ انہیں اپنے سِوا کچھ نظر آتا نہیں۔ بس وہی اپنے میدان کے رستم زمانہ ہیں اور باقی سب طِفل۔ اپنے محلّہ میں ہمسایوں سے اسطرح پیش آتے ہیں جیسے کہ ان کی پہچان اُسی کے نام سے ہے۔ زبان سے نہیں ہاتھ ہلا کر سلام کا جواب دیتے ہیں۔

ایسے عالم دین اپنے آپ کو مولانا اشرف الحق تھانویؒ، سیاستدان گاندھی اور جناح، سکالر جارج برناڈ شا، ادیب اپنے آپ کو شیکسپیر اور شاعر اپنے آپ کو غالب اور اقبال کے ہم پلہ ہی نہیں بلکہ انداز بیان سے اپنے کو ان سے ایک درجہ آگے تصور کرتے ہیں۔ جب سوچ کا یہ معیار ہو تو آپ خود اندازہ لگائے کہ ہمارا حال کیا ہے اور ہم کہاں ہیں۔ ہمارے ان رئیس الحجام صاحبان کو کون سمجھائے اور بتائے کہ گاندھی، جناح، ابوالکلام آزاد، غالبؔ، شیکسپیر کو کوئی ایواڑ نہیں ملا تھا، ہمارے اپنے عالم اور ادباء، رسول میر، محمود گامی، شمس فقیر کو کوئی خطاب نہیں ملا تھا لیکن لوگ آج بھی انہیں جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ اُن کے کارنامے چھپے ہیں۔ ہر ایک کی زبان پر انکا نام ہے۔

ہمارے یہ رئیس الحجام پانی کے بُلبُلے ہیں۔ کاش یہ خود کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھ پاتے۔ ابھی حال ہی میں میرے ایک دوست نے مجھے اپنی تحریر کردہ ایک کتاب دی تھی۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میرے ایک ساتھی نے کتاب دیکھی اور فرمانے لگا۔ ''بھئی۔ میں ایسی کتابیں نہیں پڑھتا۔ بیرون ملک کے رائٹرس کی بات

ہے۔ فلسطین ہو یا کوئی اور ملک ہر جگہ پتھر باز موجود ہیں اور پتھر بازی ہوتی ہے۔

آپ ہمیں بُرا بھلا کیوں کہتے ہو؟ آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے پرامن جلوس بھی نکالے، ہم نے ہتھیار بھی اٹھائے، ہم نے سیمنار اور دستخطی مہم کا بھی سہارا لیا لیکن بدلے میں ہمیں کیا ملا۔ خون خرابا، عصمت دری، بے عزتی، اسیری اور نہ معلوم کیا کیا! ہمارے پاس اب پتھر بازی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حیف اس بات پر ہے کہ جب ہم پتھر مارتے ہیں تو ہم شر پسند ہیں اور جب وہ گولیاں برساتے ہیں وہ امن کی بحالی ہے۔ ہاں اب تو سرکار نے بھی ایک نئی فوج تیار کی ہے جو پتھر بازوں پر پتھر مار یگی اور اسکا نام (Counter Stone CSPF Pelting Force) رکھا گیا ہے یعنی اب سنگبازوں کی بھی چاندی ہے اور انکو سرکاری نوکری ملنے والی ہے کیا خوب ہے!

ہاں میں بات کر رہا تھا۔ پتھر بازی کی اور پتھر بازوں کی۔ انکی اپنی ایک تنظیم ہے جسکا نہ کوئی لیڈر ہے اور نہ کوئی باس (Boss)۔ اُن کو نہ اُدھر سے پیسے ملتے ہیں اور نہ اِدھر سے۔ یہ سب کم عمر ہیں اور 1990ء کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اپنی مرضی کے آپ مالک ہیں اور انہیں ع، غ، ک، گ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اگر ان کا کوئی ساتھی زخمی ہو جائے یا اللہ کو پیارا ہو جائے تو بدلے کی آگ میں پتھر بازوں کی جماعت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ انہیں نفع نقصان کا کوئی غم نہیں۔ دوستوں کی خاطر جان کی بازی لگاتے ہیں۔

رہی بات ہمارے یہاں روز ہونے والی پتھر بازی کی۔ سرکار اور اسکے وردی پوش کارندے بھی اس تحریک کو دبانے میں ابھی تک ناکام ہی نظر آتے

میں پتھر باز ہوں لیکن.....

میں پتھر باز ضرور ہوں لیکن دغا باز نہیں، جعلساز نہیں، چالباز نہیں، پتھر بازی میرا نہ پیشہ ہے اور نہ مشغلہ، یہ میری میراث ہے اور وراثت میں ملا ہے۔ دہائیوں پہلے اُس وقت کے ہر دلعزیز رہنما شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے رائشماری کا نعرہ دیا اور ہمارے بزرگوں نے لبیک کہا۔ جب بھی لوگ کوئی مظاہرہ کرتے تو پولیس کے ساتھ مڈبھیڑ میں کانگڑیوں اور پتھروں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ نہ شیر کشمیر ہر دلعزیز رہے اور نہ انکی قائم کردہ محاذ رائشماری قائم رہی۔ دونوں نے دم توڑا لیکن پتھر بازی کی تحریک زندہ رہی اور ہمیں وراثت میں ملی۔ تحریک کے ساتھ ساتھ مزاحمتی طریقہ کار بھی وراثت میں ملا اور میں بھی اِن وارثوں میں ایک ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ شیر کشمیر کی اولاد اور اولادوں کی اولاد تحریک کو بھول کر سیاسی سوداگری کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔

ہاں تو بات چل رہی تھی پتھر بازی کی۔ چونکہ کانگڑی اور پتھر کا استعمال پہلے بھی مزاحمتی تحریک کے دوران ہوتا تھا آج بھی ہوتا ہے، لیکن اب .....صرف پتھروں کا استعمال ہوتا ہے کیونکہ اب کانگڑی اور کوئلے کافی مہنگے ہوگئے ہیں۔ پتھر بازی کا طریقہ کار ہماری رگوں میں موجود ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اِسے دبا نہیں سکتی۔ پتھر بازی تو پوری دنیا میں ایک مزاحمتی ہتھیار کی طرح

سٹیٹس سِمبل

انگریزی میں 'سٹیٹس سِمبل' کہیئے یا اردو میں ''نشانِ رتبہ'' بات ایک ہی ہے۔ ایک زمانے میں عزت، شہرت، ایمانداری، اخوت، ہمدردی، انسان دوستی، ملنساری جیسے اوصاف کو 'سٹیٹس سِمبل' مانا جاتا تھا۔ پھر ایک اور دور آیا جب 'سٹیٹس سِمبل' کے لوازمات ہی بدل گئے۔ پاش کالونی میں رہنا، اپنی گاڑی ہونا اور کسی مشہور انگلش میڈیم سکول میں بچوں کا زیرِ تعلیم ہونا، ان چیزوں کے ہونے کو 'سٹیٹس سِمبل' مانا جانے لگا۔ لیکن یہ دور بھی زیادہ دیر نہ رہا۔ وقت بدلنے میں دیر نہیں لگتی اور وہی حال ہمارے اس ''سٹیٹس سِمبل'' کا ہُوا۔

ابھی حال ہی میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں گیا تھا۔ اُس کے ایک ہمسایہ کو پولیس کی ویجیلنس ونگ نے حال ہی میں گرفتار کیا تھا اور پھر ضمانت پر رہا بھی کیا تھا۔ یہ گرفتار ہوئے صاحب میونسپلٹی میں ایک ملازم ہیں۔ جب میں نے اپنے رشتہ دار سے پوچھا کہ اسکے ہمسایہ کو کس وجہ پر ویجیلنس والوں نے گرفتار کیا تھا تو اس نے کہا کہ یہ تو اُسے معلوم نہیں۔ بلکہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ہمسایہ کے خلاف کوئی ایسی کاروائی عمل میں لائی گئی ہے اُسے اس بات کا علم تب ہوا جب اس ہمسایہ کی بیگم صاحبہ نے میرے اس رشتہ دار کی بیگم کو فون

ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وامق مشتاق پر ٹائیر گیس مار کر اسکی جان لی۔ سچ تو یہ ہے کہ وامق نہ پتھر باز تھا اور نہ پتھر بازی میں شریک تھا۔ وامق پر پولیس ایکشن کے بارے میں سرکار کے پاس تو ابھی کل تک کوئی جواب نہیں تھا لیکن ابھی ابھی معلوم ہوا کہ پولیس نے وامق کو پتھر باز قرار دیا ہے اور ثبوت کے طور پر پولیس یہ کہہ رہی ہے کہ اِس وقت بھی وامق کی قبر پر ایک بڑا پتھر (کتبہ) موجود ہے اور اس سے بڑھ کر کیا ثبوت چاہئے۔ خیر یہ تو رہی سرکار کی بات جو اشاروں پر ناچتی ہے۔ لیکن کہنے کا صرف یہ مدعا ہے کہ آپ ہمیں ہی کیوں پتھر باز کہتے ہو۔ یہاں کی سرکار تو اس بات پر تُلی ہوئی ہے کہ ساری قوم پتھر باز ہے۔

پتھر بازی کوئی عیب نہیں یہ تو دلاوری ہے۔ بزدلی نہیں جرأت مندی ہے۔ آپ بھی اگر جرأت مند، باغیرت، جوشیلے ہیں تو آیئے اک پتھر اٹھا کر ماریئے۔ کیا دوران حج شیطان پر پتھر نہیں مارے جاتے۔ وہ تو علامت ہے یہاں تو حقیقت ہے۔ میں یہ آواز بلند، باہوش وحواس حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ میں پتھر باز ہوں میں پتھر باز ضرور ہوں لیکن دغا باز نہیں، جعلساز نہیں، چالباز نہیں.....

☆☆☆

درجہ دیکر بڑے بڑے دانشوروں سے بحث ومباحثہ کرنے کی کوشش میں جب کچھ بول نہیں پاتے تو باہر نکل کر سیدھے سادھے لوگوں پر عالم ہونے کا رعب جما کر اپنا 'سٹیٹس سمبل' قائم کرتے ہیں فلاسفرِ زمانہ۔

بھئی! کون 'سٹیٹس سمبل' پانے کا خواہشمند نہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ مجھے بھی 'سٹیٹس سمبل' ملے مگر کیا کریں۔ اس کے لئے جو لوازمات ہیں میں پوری نہیں کرسکتا۔ ضمیر کا سودا، چہرے پر چہرہ، جھوٹ کا پلندہ، عزت کی نیلامی، ہاں میں ہاں ملانا اور سب سے بڑھ کر ایمان فروشی، یہ میں نہیں کرسکتا اور ایسے ہی بہت سارے لوگ جو ایسا نہیں کرسکتے مگر میرا ایک دوست ہے جسکی تمنا تھی کہ اُسے 'سٹیٹس سمبل' مل جائے اس نے متذکرہ بالا طریقوں سے ہٹ کر نیا طریقہ اپنایا۔ پہلے اس نے بہت سے لوگوں سے لاکھوں روپیہ بٹورے اور وعدہ کیا کہ انکو وہ نوکری دلائے گا، جب اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی تو ایک غیر معروف سیاسی پارٹی سے وابستہ ہوگیا۔ اور اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ ضمانت تو ضبط ہوگئی لیکن پولیس سیکورٹی مل گئی۔ اب کس کی مجال کہ کوئی اُسے دی ہوئی رقم کا تقاضہ کرے۔ کوئی سرکاری یا نیم سرکاری تقریب ہو تو میرے یہ دوست آپ کو ضرور نظر آئینگے اور اسکو خوشی اس بات پر ہے کہ اُسے نام نہاد 'سٹیٹس سمبل' حاصل ہوا ہے۔ کیا خوب ہے ہمارا 'سٹیٹس سمبل'۔

☆☆☆

پر بتایا۔ ذرا آپ بھی اس فون کال پر غور فرمائیں۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ہم تو کافی پریشان تھے۔ پچھلے دنوں ویجیلنس والوں نے ہمارے گھر پر چھاپہ مارا۔ تمہیں تو پتہ ہے ہماری ترقی ہمارے اڑوس پڑوس کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مکان بنایا، گاڑی لی تو آنکھوں میں کانٹا بن گئے۔ پہلگام میں جو ہماری ہٹ ہے وہ تو آج سے دس سال پہلے ہم نے تعمیر کی ہے اور جموں کا مکان تو پچھلے سال 90 لاکھ روپے میں خریدا اللہ کے فضل و کرم سے دلی میں ایک فلیٹ تو پہلے سے ہی موجود تھا اور اپنا ایک باغ ہے۔ اب کیا کریں خدا کی اس ناگہانی عنایت سے سماج میں ہم جو اعلیٰ 'سٹیٹس سمبل' حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، ہمارے دشمنوں کو جلن ہوتی ہے اور کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ نقصان پہنچے۔ خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔ جس کے پاس کوئی سٹیٹس سمبل نہ ہو وہاں ویجی لنس کا کیا کام؟ ہمارے پاس سب کچھ ہے اسلئے ویجیلنس والوں کا ہمارے گھر آنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔''

اس ٹیلیفون کال سے آپ خود اندازہ لگائے کہ کس طرح ہمسایہ کی بیگم صاحبہ اپنے اعلیٰ رتبے کا جواز پیش کر رہی ہے۔ یہ تو رہی بیگمات کی بات کہ کسطرح وہ ایک دوسرے پر اپنے سٹیٹس کو جتلا رہی ہیں۔ مگر یہاں کے کچھ آدم زاد مرد بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہتے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ ناخواندہ اپنے لباس پر فرہنگی عطر چھڑک کر مفتیوں اور قاضیوں کے صف میں شامل ہو کر ایسی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں کہ اکثر مجالس میں علما کو تاک کے ساتھ ساتھ کانوں میں بھی روئی دبا کر اس مصیبت کو برداشت کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور کچھ ایسے مرد بھی ہیں جو اپنے ظاہری وجود پر بازاری غازہ مل کر اپنے آپ کو رئیس العلم کا

دو دہائی قبل ہمارے علاقے سے ایک خاصے اثر رسوخ والے شخص کو حزب اختلاف کی طرف سے انتخاب لڑنے کا موقعہ ملا۔ ووٹ بٹورنے کیلئے کافی محنت کی اور گھر گھر اور گلی گلی کے چکر کاٹے روپیہ پانی کی طرح بہایا مگر آخر پر جب نتیجہ نکلا تو الیکشن میں ہار ہوئی۔ الیکشن ہارنے کے بعد ان صاحب نے ایک جلسہ بلایا اور اپنی ہار کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ اسباب میں جو خاص بات بتائی وہ یہ تھی کہ ان کی ہار کے پیچھے ایک انٹرنیشنل سازش تھی۔ اس پر مجھے بحث نہیں کرنی ہے مگر بات یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی تقریر ختم کی تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور وہیں پر میں نے ارادہ کیا کہ جب یہ صاحب دوبارہ کبھی الیکشن میں کھڑے ہونگے میں انکو ضرور ووٹ دونگا۔ اللہ کا کرنا تھا کہ دوسرے سال پھر الیکشن ہوئے مگر اس بار ان صاحب نے برسر اقتدار کا پارٹی کا منڈیٹ حاصل کیا۔ الیکشن ہوا اور میں نے ووٹ ڈالا اور اسی صاحب کو۔ الیکشن کا نتیجہ آ گیا اور ہمارے یہ صاحب جیت گئے۔ جیت کی خوشی میں جلسہ بلایا گیا اور یہ صاحب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مائیک پر آ کر فرمانے لگے ''بھائیو اور بہنو۔ ہم نے الیکشن جیت لیا یہ سب کیلئے خوشی کی بات ہے۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ہماری جیت ہوگی کیونکہ میں نے خواب دیکھا تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے حق میں ووٹ ڈالنے کیلئے آسمانی مخلوقات آئیں گیں اور ایسا ہی ہوا.....'' یہ سن کر میں ششدر رہ گیا کہ میرا ووٹ اس کے کسی کام نہ آیا بلکہ میرا ووٹ ڈالنے سے پہلے ہی آسمانی مخلوق نے یہ کام کیا تھا۔ اور مجھے ووٹ ڈالنے کا عمل صرف دکھاوے کیلئے تھا۔ باقی ڈالنے کی حکمت عملی

یہی سیاست ہے

پرانی کہاوت ہے ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائیز ہے۔'' زمانہ بدل رہا ہے اور اسکے ساتھ کہاوتیں یا تو بدل گئیں یا ان کا دائرہ وسیع ہوا۔ یہی حال اس کہاوت کا بھی ہوا۔ اب محبت جنگ کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی سب کچھ جائیز ہے۔

یہ سیاست بھی عجیب کھیل ہے۔ کل تک اپنے رقیبوں کو گندی نالی کے کیڑے کہنے والے آج انہیں اپنے سر کے تاج بنا رہے ہیں اور قوم دشمن، کنبہ پرور اور استحصالی قوتوں کو نہایت بے شرمی سے اعلیٰ درجہ دے رہے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے اقتدار حاصل کرنے کیلئے یہ اُن کی مجبوری ہے۔ کیونکہ اب تو ہول سیل میں کوئی پارٹی الیکشن جیتتی نہیں۔ نہ تو اب بخشی صاحب کی مہربانی باقی ہے اور نہ ہی حسن پاچہ کی دزدِ دلاوری، ہاں اگر ابھی کچھ باقی ہے وہ ہے دلی والوں کا آشیرواد لیکن کبھی کبھی کچھ نظر نہ آنے والے محرکات کا بھی دخل ہے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن انتخاب لڑنے والے ایک امیدوار کی کہانی یہی بتا رہی ہے۔

فائدہ ہی فائدہ ہو مثلاً تمام ممبران اسمبلی/ کونسل/ وزارت کی تنخواہیں بڑھانا، ممبران کے بچوں کو تعلیمی وظائف اور نوکری میں ترجیح، رہنے کیلئے سرکاری فلیٹ، اپنی مرضی پر تعمیراتی ٹھیکوں کی الاٹمنٹ یہ تو ہوئی انفرادی سطح کی ترجیحات اور پروگرام۔ پارٹی لیول پر کابینہ میں نفع بخش اور کچھ 'پانے والے' عہدوں کی برابر تقسیم، مختلف کارپوریشنوں کے سربراہوں کی مساوی الاٹمنٹ وغیرہ۔

اب جبکہ مخلوط سرکاروں کا پروگرام اور انکی سیاست عیاں ہے تو نہ معلوم ہمارے یہ بیچارے لوگ سڑکوں، ٹرانسفارموں، بجلی، پانی، روزگار، راشن جیسے چیزوں کی دستیابی یا فراہمی کے نعرے کیوں لگاتے ہیں جبکہ مشترکہ پروگرام میں یہ باتیں شامل ہی نہیں ہوتیں۔

☆☆☆☆☆

کیلئے پہلے سے ہی الگ کارندھے مقرر کئے گئے تھے۔ جن کو مجھ جیسے سادہ لوح لوگ بھلا ووٹ چور ہی کیوں نہ کہیں مگر سیاسی ڈائری میں ان کو آسمانی مخلوق کا درجہ حاصل ہے۔ خیر ہم بات کر رہے تھے سیاست کی اور پہنچ گئے الیکشن پر۔ سیاسی وفاداریاں بدلنا اب کوئی اچھنبے والی بات نہیں۔ آیا رام گیا رام کا سلسلہ نہ تھمنے والا ہے۔ ایسا کرنا تو ہمیں بہت ہی غلط لگتا ہے اور اسے ہم سیاسی سوداگری کا نام دیتے ہیں۔ حال ہی میں جب میری ملاقات ایسے ہی ایک 'لیڈر' سے ہوئی جو اپنی وفاداری اکثر بدلتا رہتا ہے تو میں نے بڑے سلیقے سے انہیں بتایا کہ وہ ہر سال دو سال کے بعد سیاسی وفاداری بدلتے ہیں یہ انکو زیب نہیں دیتا۔ میری بات سُن کر وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ ''یہ سیاست ہے کوئی مذہب نہیں، بدل دیا تو گناہ ہو گیا۔'' سیاست اب دکانداری ہے۔ جہاں سے خریدار ملے وہاں دُکان کھولے' اُن کی اس بات نے میری آنکھیں کھول دیں اور سیاست کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا۔ اب چونکہ کوئی بھی پارٹی الیکشن اکثریت کی حاصل نہیں کر پاتی اس لئے کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت بنانا ہمارے سیاست دانوں کی ایک بہت بڑی مجبوری بن گئی ہے۔ اگر چہ الیکشن لڑنے سے پہلے اِن دونوں پارٹیوں کے انتخابی منشور مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہوتے ہیں لیکن مخلوط حکومت تشکیل دینے کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے۔ دو انتخابی منشوروں کے متبادل ایک نیا منشور جسے اب کم از کم مشترکہ پرگرام (common minimum programme) کہتے ہیں، کو مرتب کیا جاتا ہے۔ یہ پروگرام اُن بنیادوں پر مرتب کیا جاتا ہے۔ جن پر دونوں مخلوط پارٹیوں کو کوئی تضاد نہ ہو اور دونوں کا

ایسے مسیحا کو کھوجنے میں ناکام رہے جو اُن کی دیرینہ کو بھرلانے میں مددگار ثابت ہو جس کیلئے وہ ہر قسم کی قربانی سال ہا سال سے دے رہے ہیں۔

''ہم کیا چاہتے؟..... چاہنے سے اگر سب کچھ ملتا۔ تو سرے سے ہی لوگ کچھ کرتے نہیں۔ بلکہ چاہتے اور ہو جاتا۔ ''چاہنے'' اور ''ہونے'' میں بڑا فرق ہے۔ اس کیلئے ہمت، تدبیر، طاقت اور پکے ارادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ ہماری اس غریب قوم میں کہیں موجود نہیں۔ اگر کہیں موجود بھی ہے تو وہ نقار خانے میں طوطی کی صدا کے مترادف ہے۔ ہاں اگر اس سادہ لوح قوم میں کوئی جذبہ کارفرما ہے وہ ہے ''بھروسہ'' معمولی سی تقریر کے جھانسے میں آکر بغیر سوچے سمجھے بھروسہ کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ ''بھروسے'' کے اتنے قائل ہیں کہ جتنا خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں اتنا ہی شیطان پر، سوچتے ہیں کہ یک نہ شد دو شُد اور اسی دوراہے پر یہ قوم برابر پچھلے 60 سالوں سے کھڑی اپنی آنکھوں میں کبھی آزادی کے خواب سجانے اور کبھی غلامی کے آنسوؤں کی مالا پروتے میں محو غفلت ہے۔ اور زمانے کے آقا انہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی طرح کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ہانکنے میں کوئی عار یا شرم محسوس نہیں کرتے۔ خدا بھلا کرے ہماری اس قوم کا۔

☆☆☆

مسیحا کی تلاش

ریشیوں منیوں کی اس وادی کو ہر طرف سیاست کی آندھی نے ایسے آگھیرا ہے کہ اب نہ یہاں کوئی ریشی رہا اور نہ کوئی مَنی ، البتہ اُن کے مزاروں اور شمشان گھاٹوں پر خود غرض، ریاکار اور دھوکہ باز عیاروں کا ایک ایسا گروہ ہاتھوں میں مکر وفریب کے چراغ لئے ہوئے نمودار ہوا کہ ہمارے سادہ لوح بندے یہ سمجھ بیٹھے کہ ان کی وساطت سے خدا یا بھگوان کو نذر و نیاز یا چڑھاوا پہنچا کر انہیں عافیت کا سامان میسر ہوگا۔ اُن کے اس نیاز یا چڑھاوے سے عیاروں کو عافیت ملنے کے ساتھ ساتھ اپنے محل روشن کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ مگر اس بدنصیب قوم کے لوگوں کو تاریکی اور اندھیروں کے سوا کچھ نہ ملا۔ کبھی اِن عیاروں نے معصوم لوگوں سے نذرانے کے نام پر نقدی وصولی اور کبھی معصوم جانوں کی قربانی حاصل کی۔ مگر اس بے بس اور ناسمجھ قوم نے بغیر عقل سے کام لئے اِن عیاروں کی ہر مانگ پر لبیک کہا۔ جس وجہ سے وہ دن بدن پسماندگی، لاچاری اور غریبی کی دلدل میں دھنستے گئے۔ اور آج تک وہ کسی

ہے۔ حد یہ ہے کہ رہبر تعلیم اساتذہ بھی پیچھے نہیں۔ ایک رہبر تعلیم استاد اپنے بدلے بھائی جو دسویں میں فیل ہوا کو اپنی جگہ سکول میں بھیجتا ہے کیونکہ خود وہ کوئی کاروبار کرتا ہے۔ سب کنٹریکٹ کا یہ تماشا بھی عجیب ہے۔

کیا خوب کہا ہمارے ایک محترم ساتھی نے۔ جنہوں نے بیس سال محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس کام کیا اور پھر مستعفی ہوئے۔ یہ پوچھنے پر کہ اس نے یہ نوکری کیوں چھوڑی تو انکا جواب سن کر ہم بھی سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اسکا کہنا تھا کہ دوران ملازمت وہ ایکبار ایک آٹو موبائیل ورکشاپ کے سامنے کھڑے گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک، کہیں سے آواز آئی ''ماسٹر جی اسلام علیکم'' ادھر اُدھر دیکھا تو زیر مرمت ایک میٹاڈور کے نیچے کام کر رہے مستری پر نظر پڑی۔ گرد آلود ملبوس اور چہرے پر کالک لگے ایک لڑکا میٹاڈور کے نیچے سے باہر آ گیا اور کہنے لگا۔ ''ماسٹر جی۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ آپ نے مجھے پڑھایا ہے اور آپ کی بدولت یہ کام کر رہا ہوں'' ماسٹر جی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ وہ وہاں سے چل پڑا۔ چند دن بعد وہ ایک ٹانگے پر سوار ہو کر کہیں گیا۔ ٹانگے سے اُتر کر ٹانگے بان کو جونہی کرایہ دینے لگا تو نوجوان ٹانگے بان نے یہ کہکر کرایہ لینے سے انکار کیا کہ وہ ماسٹر جی کا شاگرد رہا ہے اور تیسری تک ماسٹر جی نے اُسے پڑھایا ہے۔ وہ کرایہ کیسے لے سکتا ہے۔ ماسٹر جی نے کچھ کہے بغیر ہی اپنا راستہ لے لیا۔ علاقے کے پولیس سٹیشن میں ماسٹر جی کو تھانے کے منشی سے یارانہ تھا۔ اتوار کا دن تھا تو ماسٹر جی اپنے منشی یار سے ملنے تھانے گیا۔ دونوں چائے پی رہے تھے تو تھانے کے لاک اپ سے ایک آواز آئی ''ماسٹر جی سلام'' ماسٹر نے دیکھا تو لاک

اُستادِ گوسفندان

کون ایسا احسان فراموش ہوسکتا ہے جو معمار قوم کی شان میں کوئی گستاخی کرنے کی جسارت کرے۔ آج کا موضوع اُن اشخاص کے نام منسوب ہے جو 1991ء اور اسکے بعد کی دھائی میں امتحانات من سلویٰ پاس کر کے استادوں کے صفحوں میں شاملِ ہو گئے ہیں۔

کچھ برس پہلے میں نے دو ہمسایوں کو جھگڑتے دیکھا، دونوں پیشے سے استاد تھے۔ جب میں نے انہیں یہ باور کرنے کی کوشش کی کہ انہیں یہ زیب نہیں دیتا تو وہ اور بھڑک اُٹھے اور جھمی ایک ساتھی نے کہا یہ معمار نہیں استاد گوسفندان ہیں۔ برائے نام کے یہ استاد قوم کی تعمیر میں کونسا رول ادا کر سکتے ہیں جو خود اپنے منصب سے ناواقف ہیں۔

ہمارے یہاں کا عالم ہی عجیب ہے۔ استاد کا پیشہ اب سائیڈ جاب بن کے رہ گیا ہے یا تو یہ لوگ پرائیوٹ ٹیوشن سینٹر چلاتے ہیں یا کوئی دوسرا کاروبار کرتے ہیں۔ سکولوں میں حاضری برائے نام اور پڑھانے کا کام درِ بام ہو کے رہ گیا

تھی۔ یہ اسی ضمن میں کہا گیا ہے۔ ماسٹر جی اگر کچھ نہیں تحریک تو سمجھ گئے اور ہو بہو یہ معنی اور مطلب اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ اب آگے جا کر یہ لڑکے یا شاگرد کونسا راستہ اختیار کرینگے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اِن استاد گوسفندان کو ہمارے حاکموں نے قوم کی تعمیر کا کام سونپا ہے۔ وہ تعمیر کیسے ہوگی، اسکی صورت کیا ہوگی خدا جانے! ان اشخاص کا محکمہ تعلیم کیساتھ عقد ہی نہیں ہے تو بقول شاعر۔

مُرغیاں کب نکاح کرتی ہیں
انڈے حرام ہیں پیارے

☆☆☆

اپ میں بند ایک لڑکا اسکی طرف مخاطب تھا۔ ماسٹر جی نے لڑکے سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں بند ہے تو لڑکے نے نہایت حلیمانہ انداز میں کہا'' ماسٹر جی آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ آپ نے مجھے پڑھایا ہے میں آپکا شاگرد رہا ہوں..... ۔ابھی اس بات پوری نہیں کی تھی کہ منشی نے کہا کہ یہ ایک نمبر کا جیب کترا ہے۔ اِسے پہلے بھی ہم نے کئی بار پکڑا ہے لیکن یہ باز آتا نہیں۔ ماسٹر جی نے جب اپنے شاگردوں کے احوال دیکھے تو سوچا اگر وہ بدستور پیشہ استاد سے وابسطہ رہے تو آگے انکے شاگردوں کا حال کیا ہوگا اور یہی سونچکر مستعفی ہوئے۔ خیران صاحب کو قوم پر رحم آ ہی گیا مگر وہ جو ابھی تک خود ناخواندہ ہیں خواندگی مہم کو کہاں تک آگے لے سکتے ہیں خدا ہی جانے۔

ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ اور اسکے راوی ایک معزز اور قابل استاد ہیں ۔بتا رہے ہیں کہ ایک استاد اپنے کلاس روم میں اردو کا مضمون پڑھا رہے تھے تو کسی شریر لڑکے نے ماسٹر جی سے ''آئے بہار کو ہم بانٹ لیں'' کا مطلب پوچھا۔ ماسٹر جی نے اپنے والد کیساتھ 1990ء میں میٹرک کا امتحان بیرونی امداد پر فسٹ کلاس میں پاس کیا تھا اور کمانڈر کی سفارش پر محکمہ تعلیم میں مدرس مقرر ہوا تھا۔ اپنا نام لکھنے کے سوا اسکو کچھ آتا بھی نہیں تھا۔ خیر لڑکے نے جو پوچھا تو جواب دینا تو تھا۔ فوراً دوسرے استاد سے مدد طلب کی۔ وہ بھی غضب کے استاد تھے۔ تو سمجھایا کہ اصل میں یہ شعر ''آئے بہار (Bahar) کو ہم بانٹ لیں'' نہیں بلکہ آیئے بہار (Bihar) کو ہم بانٹ لیں'' ہے یہ ان دنوں کا شعر ہے جب بہار صوبہ کو دو حصوں یعنی بہار اور جھارکھنڈ میں بانٹنے کی تحریک چل رہی

صادر کرنا تھا کہ پرندہ فریادی ہوا' بادشاہ وقت میری عرضداشت ہے اس شخص کو سزا میری مرضی کے مطابق دی جائے''۔ بادشاہ نے عرضداشت منظور کی اور پرندے سے کہا کہ وہ بتادے کہ کیسی سزا اس شخص کو دیجائے۔ پرندے نے عرض کی ''بادشاہ سلامت۔ اس شخص کی داڑھی منڈوائی جائے، سر سے پگڑی اتاری جائے، ہاتھوں سے تسبیح اور عصا چھین لئے جائیں۔ تاکہ اسکا ظاہری لباس کسی اور کو دھوکہ نہ دے'' کیا عقلمندی کی بات اس پرندے نے کی ہے۔ لیکن..... آج ہم انسان یعنی اشرف لمخلوقات ہو کے بھی ایسا نہیں کر سکتے نہ ہم میں ایسی جرات اور بیباکی ہے اور نہ انصاف کی کرسیوں پر شنوائی کرنے والے ایسے حاکم۔ کتنے ہی رنگے سیار، شیطانی فطرت والے لوگ چہرے پر شرافت کا غازہ لگائے نظر آتے ہیں۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام۔ بے چارے معصوم اور انجان لوگ کس طرح انکی بناوٹی صورتوں سے اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں یہ عیار کہیں مذہبی پیشوا بن کر اور کہیں ووٹ بٹورنے کیلئے مسیحا، ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کے ہمدرد بن کر مختلف سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کی صورت میں انہوں نے اپنی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ نہ یہ کسی مذہب سے متاثر ہیں اور نہ انہیں انسانیت کا لحاظ ہے یہ فقط دھن کے پجاری ہیں۔ انکی مایا جال نے ہماری قوم کو اپنے شکنجے میں باندھ کے رکھا ہے اور بظاہر باہر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی چیز اس دنیا میں دائمی نہیں اور جب جب بھی دنیا میں کوئی برائی یا خرابی تجاوز کر جاتی ہے تو قانون قدرت کے تحت اس کے خاتمے کا بندوبست ہو ہی جاتا ہے۔ اور اسکی دو ہی عام صورتیں

حسرت ہے اس حضرت انسان پر

''چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے''، یہ تو آپ نے سنا ہے اور میں نے بھی۔ معصوم چہروں کے پیچھے کبھی کبھی ہیبت ناک حقیقتیں ہوتی ہیں۔ آدمی کو جب بھی دھوکے سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو اکثر اسکی وجہ یہی ہوتی ہے کہ جس آدمی سے اُسے دھوکہ ہوتا ہے اسکو پہچاننے میں اُسے غلطی ہوئی ہوتی ہے۔ آدمی کا چہرہ، اسکا لباس اور ظاہری بناوٹ قطعی طور اسکے اندورن کی عکاس نہیں ہے۔

ایک دفع پرندوں کا ایک جوڑا راستے پر پڑے دانے چُگ رہا تھا کہ اُنہیں دُور سے ایک آدمی اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ سر پر پگڑی، لباس ایک لمبا چوغہ، لمبی ڈاڑھی، ایک ہاتھ میں تسبیح پھیرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ایک عصا لئے ادھیڑ عمر کا شخص جب ان پرندوں کے نزدیک پہنچنے لگا تو مادہ پرندے نے نر سے کہا کہ یہاں سے اُڑ جائیں کہیں یہ شخص ہمیں نہ مار ڈالے۔ نر پرندہ ہنس پڑا اور مادہ سے کہنے لگا یہ شخص تو شکل وصورت اور لباس سے ہی بزرگ آدمی لگ رہا ہے یہ ایسا نہیں کر سکتا۔ جب یہ شخص نزدیک پہنچا تو اُسنے پتھر اٹھا کر ان پرندوں پر دے مارا اور بیچاری مادہ کو پتھر لگ گیا اور تڑپتے تڑپتے اُس نے جان دی۔ نر بھاگ اڑا اور پچھتانے لگا۔ وہ اس سرزمین کے بادشاہ کے پاس فریاد لے کے گیا۔ بادشاہ نے شنوائی کی اور آدمی کو قصوروار ٹھہرایا۔ ابھی بادشاہ کو سزا کا حکم

شفاخانے سے دواخانے تک

آپ کس سوچ میں پڑ گئے، یہی نا کہ شفاخانہ ہی دواخانہ کو کہتے ہیں، یا یوں کہیے شفاخانہ اور دواخانہ ایک ہی شعبہ ہے۔ مگر آپ کی سوچ یہاں پر صحیح نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ شفاخانہ، دواخانہ سے کیسے مختلف ہے۔

آج کل کے دواخانے یا یوں کہیے ہسپتال پہلے شفاخانے کہلاتے تھے۔ اُس وقت جب کوئی بیمار وہاں علاج کیلئے جاتا اُسے شفا مل جاتی تھی اور وہ صحت یاب ہوتا تھا مگر اب اگر کوئی بیمار دواخانے میں جاتا ہے تو اُسے دوا مل جاتی ہے، شفا کی تو بات ہی نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اب بھی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے اور مریض صحت یاب ہوتے ہیں مگر ان دواخانوں میں نہیں بلکہ پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلنکوں میں.....وہ بھی.....موٹی موٹی رقمیں ادا کر کے۔

ویسے اگر دیکھا جائے تو دواخانوں کا وجود بھی اصل میں ہماری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ رُب کائینات اکثر اوقات آپکی ہماری دعائیں قبول کر ہی لیتا ہے لگتا ہے کچھ دعائیں جو ہم نے دانستہ یا نادانستہ رب سے مانگی وہ قبول ہوگئی ہیں۔ جب اکثر کوئی

تاریخ سے ملتی ہیں ۔اول یہ کہ کوئی پیغمبر دنیا میں آتا ہے یا کوئی عذاب نازل ہوتا ہے۔ پیغمبر قوم کی اصلاح کرتا ہے اور عذاب قوم کو ختم کر دیتی ہے۔ چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہذا اب صرف دوسری صورت باقی ہے۔ اگر ہم اور ہماری قوم اب بھی نہیں سدھرتی ہے تو عذاب الٰہی لازم وحق ہے۔ اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو سدھاریں۔ کوئی فرشتہ آسمان سے نہیں آئیگا لہذا ہمیں خود پہل کرنی ہوگی۔ آج نام نہاد اصلاح پسند اور قومی غمخوار صرف اور صرف رنگے سیار ہیں۔ اُن کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ قوم کی تباہی، بربادی میں انکا بڑا رول رہا ہے۔ پاکباز لائق دیدار باش۔ لیکن افسوس نہ یہ پاکباز ہیں اور نہ لائق دیدار۔ خدا ان کے کرتوتوں سے قوم کو آشنا کردے۔

افسوس اس بات پر ہے کہ شرافت، ایمانداری، خلوص اور زہد وتقویٰ کا لباس پہنے ہوئے یہ لوگ خود ہی تمام برائیوں کے جڑ ہیں لیکن اپنے وعظ ونصیحت میں ان برائیوں کے خلاف بولتے رہتے ہیں۔ کیا خوب کہا گیا ہے

حسرت ہے اس حضرت انسان پر
خود کرے کار بد لعنت کرے شیطان پر

اُن کے چہرے باہر سے روشن دکھائی دیتے ہیں لیکن اصل میں یہی بات صحیح ہے چہرہ روشن اندرونم بخبر وآتش فشاں۔

☆☆☆

دویات کا ایک بڑا نسخہ تھما دیتے ہیں کیونکہ یہ کمیشن کی بات ہے۔ بہت سارے ڈاکٹر صاحبان دو دو ہاتھوں سے لوٹ میں مشغول ہیں ایک طرف خزانہ عامرہ سے نان پریکٹرائزنگ الاونس حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے دولت خانوں میں پرائیوٹ پریکٹس کر کے خوب مال کماتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کوئی بھی ٹیچر، پروفیسر، وکیل، انجینئر یا منیجر یہ نہیں چاہتا ہے کہ اسکا بیٹا اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے یہ ممکن ہے کہ کہیں پر بات ایسی نہ ہو۔ مگر جہاں تک ڈاکٹر صاحبان کا تعلق ہے، اکثر یہ چاہتے ہیں کہ ان کا بیٹا بھی ڈاکٹر بنے۔ وجہ صاف اور واضح ہے یعنی یہ پیشہ بڑا کماؤ ہے اور گھر بیٹھے لاکھوں روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے اور آمدنی کا ذریعہ سہ رخی ہے اور کہیں کہیں چہار رخی۔ یعنی اول تو سرکار کی طرف سے ملنے والی تنخواہ، دوئم دوا کمپنیوں کی طرف سے ملنے والا کمیشن، سوئم فریضوں سے حاصل ہونے والی فیس اور کہیں کہیں پر نان پریکٹرائزنگ الاونس۔ گویا پانچوں انگلیاں گھی میں۔ ایسا نفع بخش پیشہ اور کوئی نہیں۔ اب ان حضرات کو پیسے کے بغیر کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا۔ حال ہی میں میرے ایک ساتھی کو اپنے والد کے مرض کے بارے میں ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا پڑا، جو اسکے والد کا علاج کر رہا تھا۔ باہر فیس لینے والے آدمی کو نسخہ دیا اور اندر جانے کی بات کی تو اُسے اندر جانے کیلئے بلکہ صرف ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد کی بیماری کے بارے میں بتانے کیلئے پہلے فیس ادا کرنا پڑی، اسی ساتھی نے مجھے بتایا کہ جب وہ کالج میں پڑتا تھا تو اسنے اُس وقت کے مشہور معالج ڈاکٹر علی جان سے ملنے کیلئے فیس بھری اور جب وہ ڈاکٹر صاحب سے ملا اور ڈاکٹر جان نے اسے آنے کی وجہ پوچھی تو

دعا مانگی جاتی ہے تو ساعتِ حسن میں قبول ہو ہی جاتی ہے۔ پہلے ہم ''مرضن شفا'' مانگتے تھے اور بعد میں ''مرضن دوا'' اسطرح شفا کے بدلے دوا مانگ کر شفا خانوں کو دواخانوں میں تبدیل کیا۔ دعاوں کی بات چلی تو یہ بھی عرض کروں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خدا بر خلق، خلق بر خدا۔ ریاست میں نامناسب حالات سے پہلے اکثر لوگوں کی زبان پر تین کلمات تھے، مرضن دوا، سکرات الموت/ اور لفظ ''دب اور سُورخ'' کشمیری الفاظ) قدرت کا کھیل بھی نرالا ہے۔ مریضوں کو دوا ہی دوا مل رہی ہے اور گلی کوچوں میں ادویات کی دکانیں ہر جگہ موجود ہیں، سکرات الموت کی آسانی کا نیا طریقہ۔ گولی وارِدِ کشمیر ہوئی، ''دب'' کی تعبیر دھماکے کے اور سُورخ کی تعبیر آگ زنی میں دکھائی دینے لگی۔ دینے والا مانگنے والے سے عظیم ہے اور اسطرح ہماری دعاؤں اور ہماری باتوں کا اثر آپ کے سامنے ہے۔

ہم بات کر رہے تھے دواخانوں اور باتوں باتوں میں کہاں پہنچ گئے۔ خیر ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ دواخانوں کی بدولت اس قوم نے کیا کیا نہ دیکھا، کتنے گُل کھلائے ان دواخانوں میں نشیلی دوائیوں کا کاروبار دوائی کے نام پر ہونے لگا اور کتنے ہی گھروں کے چشم و چراغ اس وباء کے شکار ہوئے۔ ایک طرف بہت سارے نوجواں تباہ و برباد ہو گئے اور دوسری طرف ان دوافروشوں نے لاکھوں روپیہ کما لئے۔ ویسے ڈاکٹری اور دوائی بیچنے کا کاروبار آجکل عروج پر ہے۔ آپ کو ہر شہر اور قصبے میں پالی کلنک اور پرائیوٹ پریکٹائزنگ دکانیں ملیں گی۔ جہاں ڈاکٹر حضرات من مانی فیس وصول کرتے ہیں اور مریضوں کے ہاتھوں اپنی من پسند سب اسٹنڈرڈ کمپنیوں کی تیار کردہ ا

ماں کی لوری سے نیند کی گولی تک

''ماں کے قدموں تلے جنت ہے'' یہ میں نے سُنا ہے اور آپ نے سُنا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ماں کو اعلیٰ درجہ حاصل ہے اور اسکی خاص وجہ ماں کی شفقت، اسکا پیار، صبر جمیل، قربانی کا جذبہ اور ایثار ہے۔

میں نے اپنے ایک اُستاد محترم سے ایک کہانی سُنی ہے۔ ایک حاملہ عورت کو جب بچے کو جنم دینے کے دن قریب آئے تو ایک نجومی نے اُسے بتایا کہ اگر اسکا بچہ شام کے وقت پیدا ہوگا تو وہ ایک معمولی آدمی بنے گا، اگر اسکا جنم رات کو ہوگا تو وہ ایک امیر آدمی ہوگا اور اگر اسکا جنم صبح کے وقت ہو جائے تو وہ بادشاہ بن جائیگا۔ چند روز بعد جب اس عورت کو زچگی کی تکلیف ہوئی۔ اور بچے کا جنم دینے کا وقت پہنچا تو شام کا وقت تھا۔ اُسنے اپنے جسم کو ٹانگوں سے لٹکائے رکھا۔ کافی تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس کا بچہ صبح کے وقت جنم لے تا کہ وہ ملک کا بادشاہ بنے۔ پوری رات وہ یہ تکلیف برداشت کرتی رہی اور جب صبح ہوئی بچہ پیدا تو ہوا پر ماں وفات کر گئی۔ اس طرح ایک ماں نے اپنی جان دیدی اپنے بچہ کے مستقبل کے لئے۔ جنت تو ایسی ہی ماں کے قدموں تلے ہے۔ آدابِ فرزندی کے پیچھے یہی قربانی کارفرما ہے۔

اسنے بتایا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو صرف دیکھنے آیا تھا۔ ڈاکٹر جان نے اُسے چائے پلائی اور فیس واپس دلوادی۔ آج کی بات ہی کچھ اور ہے کہاں ڈاکٹر علی جان یا ڈاکٹر شیخ عبدالمجید۔ اللہ انکو جنت نصیب کرے۔

ڈاکٹروں اور دواخانوں کا یہ حال دیکھکر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اب ضلع ہسپتال صرف Referral Point بنے ہیں۔ کوئی بیمار اگر ان ہسپتالوں میں آتا بھی ہے تو وہ اسکو سرینگر SMHS ہسپتال یا صورہ انسٹیچوٹ روانہ کرتے ہیں۔ کیا ان ڈاکٹر حضرات کو خدا کا خوف بھی نہیں۔ یہاں کا عوام اپنے خون پسینے کی کمائی سے ٹیکس ادا کرتے ہیں اور ان ہی پیسوں پر یہ ڈاکٹر صاحبان ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بن کر انکی نظریں اور دل و دماغ بدل جاتے ہیں۔ جن کی خیرات پر یہ ڈاکٹر بنے ہوتے ہیں انکو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ وقت دور نہیں جب ان حضرات ہی کی وجہ سے دواخانوں میں تبدیل ہوئے شفاخانے اب ذبح خانوں میں تبدیل ہو جائینگے۔ جس قوم کے مسیحا ہی جلاد ہوں اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ گستاخی معاف کہیں کوئی ڈاکٹر یہ تحریر پڑھکر اس کالم نویس کو تختہ آپریشن پر نہ چڑھائے۔

☆☆☆

خود کو نوعمر ہی جتانا پسند کرتی ہیں۔

ارے بابا۔ اگر ایسی ماؤں کو لفظ ''ماں'' سے چڑ ہے، ممتا کی خوبیوں، قربانی ،ایثار، محبت وشفقت سے نا آشنا ہیں تو ہمیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایسی عورتوں کو ماں کا درجہ دیں۔ انہوں نے اپنے رتبہ اور درجہ کو خود اپنے ہی کرتوتوں سے کھودیا ہے ۔حیثیت نہیں تو حقداری کیسی؟ عورت صرف ایک حیثیت میں سب سے زیادہ قابل احترام ہے اور وہ ہے بحیثیت ماں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورت نے جو یوٹرن (u turn) لی ہے اس کی وجہ مغربی تہذیب کی یلغار، ہمارے میڈیا کا رول اور دنیاوی کشمکش ہے آجکل ہماری گھریلو زندگی میں T.V سیریز خاص کر 'زی' اور 'سٹار پلس' کے سیریلز کے اداکاروں کے ہمہ پلہ بننے کی بے ہودہ وناپاک کوششوں میں کتنی ہی ماؤں نے اپنے گھر برباد کئے ہیں۔ مانا کہ یہ کچھ حد تک صحیح ہے لیکن ہم دوش صرف دوسروں کو دیتے ہیں ۔ماں کے بدلے آیا، چھاتی کے دودھ کے بدلے ڈبے کا دودھ اور لوری کے بجائے گولی کس کی دین ہے ۔

حسرت ہے حضرت انسان پر
خود کرے کار بد لعنت کرے شیطان پر

☆☆☆

لیکن آج کی ماں.....شاید نہ اسکے پاؤں تلے جنت ہے۔اور نہ وہ ایثار کی دیوی ہے۔اپنے بچے کو گود میں پالنے کے بجائے آیا کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔بچہ ماں کی دودھ کے بجائے گائے کا دودھ یا بازاری ڈبے کا دودھ پیتا ہیں پہلے ماؤں کو بچے کا رونا اس لئے برداشت نہیں ہوتا تھا۔کیوں کہ وہ اپنے لخت جگر کی آنکھوں میں آنسوں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔لیکن آجکی ماؤں کو اپنے بچوں کے رونے سے نفرت ہے کیوں کہ انہیں موبائیل پر گھنٹوں باتیں کرنے یا ٹی وی سیریل دیکھنے میں حرج ہوتا ہے۔آجکی ماؤں کو اپنے سجنے سنوارنے۔میک اُپ کرنے،سہیلوں سے باتیں کرنے سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے اور اگر وہ کوئی نوکری کرتی ہوں تو پھر خدا ہی حافظ۔اب گھر، گھر نہیں ہوسٹل بن گئے ہیں۔ماں کی گود کو بچے کی پہلی تربیت گاہ مانا جاتا ہے۔لیکن اب بچارے بچوں کو ماں کی گود میں بیٹھنا نصیب کہاں!

بچے کے جنم کے بعد اس کے کانوں میں ماں کی محبت بھری لوری کے بول اُترتے ہی اُسے سپنوں کی سہانی وادیوں میں پہنچا دیتے تھے۔لیکن اب کی بات تو بالکل مختلف ہے۔بچوں کو سُلانے کے لئے لوری سنانے کے بجائے نیند کی گولی کھلائی جاتی ہے اب آپ ہی خدارا بتائے کیا یہ وہی ماں ہے۔جس کے پاؤں تلے جنت کی بشارت ہے۔

آجکی ماں کو یہ بھی پسند نہیں کہ انکا بچہ انہیں ماں کہہ کے پُکارے۔معلوم نہیں کیوں؟ شاید وہ ماں بننا ہی پسند نہیں کرتیں یا اس نام سے اُسے نفرت ہے۔وہ اپنے آپ کو دیدی، ججی، پیاری کے نام سے پکارنا پسند کرتی ہے اور وہ سدا

خود کو نوعمر ہی جتانا پسند کرتی ہیں۔

ارے بابا۔ اگر ایسی ماؤں کو لفظ ''ماں'' سے چڑ ہے، ممتا کی خوبیوں، قربانی ،ایثار، محبت وشفقت سے نا آشنا ہیں تو ہمیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایسی عورتوں کو ماں کا درجہ دیں۔ انہوں نے اپنے رتبہ اور درجہ کو خود اپنے ہی کرتوتوں سے کھودیا ہے ۔حیثیت نہیں تو حقداری کیسی؟ عورت صرف ایک حیثیت میں سب سے زیادہ قابل احترام ہے اور وہ ہے بحیثیت ماں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورت نے جو یوٹرن (u turn) لی ہے اس کی وجہ مغربی تہذیب کی یلغار، ہمارے میڈیا کا رول اور دنیاوی کشمکش ہے آجکل ہماری گھریلو زندگی میں T.V سیریز خاص کر 'زی' اور 'سٹار پلس' کے سیریلز کے اداکاروں کے ہمہ پلہ بننے کی بے ہودہ وناپاک کوششوں میں کتنی ہی ماؤں نے اپنے گھر برباد کئے ہیں۔ مانا کہ یہ کچھ حد تک صحیح ہے لیکن ہم دوش صرف دوسروں کو دیتے ہیں۔ ماں کے بدلے آیا، چھاتی کے دودھ کے بدلے ڈبے کا دودھ اور لوری کے بجائے گولی کس کی دین ہے ۔

حسرت ہے حضرت انسان پر
خود کرے کار بد لعنت کرے شیطان پر

☆☆☆

لیکن آج کی ماں.....شاید نہ اسکے پاؤں تلے جنت ہے۔اور نہ وہ ایثار کی دیوی ہے۔اپنے بچے کو گود میں پالنے کے بجائے آیا کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔بچہ ماں کی دودھ کے بجائے گائے کا دودھ یا بازاری ڈبے کا دودھ پیتا ہیں پہلے ماؤں کو بچے کا رونا اس لئے برداشت نہیں ہوتا تھا۔کیوں کہ وہ اپنے لخت جگر کی آنکھوں میں آنسوں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔لیکن آجکی ماؤں کو اپنے بچوں کے رونے سے نفرت ہے کیوں کہ انہیں موبائیل پر گھنٹوں باتیں کرنے یا ٹی وی سیریل دیکھنے میں حرج ہوتا ہے۔آجکی ماؤں کو اپنے سجنے سنوارنے۔میک اُپ کرنے،سہیلوں سے باتیں کرنے سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے اور اگر وہ کوئی نوکری کرتی ہوں تو پھر خدا ہی حافظ۔اب گھر، گھر نہیں ہوسٹل بن گئے ہیں۔ماں کی گود کو بچے کی پہلی تربیت گاہ مانا جاتا ہے۔لیکن اب بچارے بچوں کو ماں کی گود میں بیٹھنا نصیب کہاں!

بچے کے جنم کے بعد اس کے کانوں میں ماں کی محبت بھری لوری کے بول اُترتے ہی اُسے سپنوں کی سہانی وادیوں میں پہنچا دیتے تھے۔لیکن اب کی بات تو بالکل مختلف ہے۔بچوں کو سُلانے کے لئے لوری سنانے کے بجائے نیند کی گولی کھلائی جاتی ہے اب آپ ہی خدارا بتائے کیا یہ وہی ماں ہے۔جس کے پاؤں تلے جنت کی بشارت ہے۔

آجکی ماں کو یہ بھی پسند نہیں کہ انکا بچہ انہیں ماں کہہ کے پُکارے۔معلوم نہیں کیوں؟ شاید وہ ماں بننا ہی پسند نہیں کرتیں یا اس نام سے اُسے نفرت ہے۔وہ اپنے آپ کو دیدی، ججی، پیاری کے نام سے پکارنا پسند کرتی ہے اور وہ سدا

نے تلاوت کلام پاک کیا۔ اب تقریر شروع ہوئی ''، میرے عزیز ہموطنو، بھائیوں، بہنوں بزرگوں اور دوستو۔ آپ کا خادم آج پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ پچھلی بار آپ نے مجھے اپنا قیمتی ووٹ دیکر کامیاب کیا اور مجھے اپنی نمائیندگی کرنے کیلیئے اسمبلی میں بھیج دیا۔ ان پانچ برسوں میں جو کچھ میں نے کیا، وہ اخباروں میں آچکا ہے۔ میں نے عوام کیلیئے بہت سارے کام کیئے۔ انکو مفت تعلیم، کم قیمت پر راشن، بجلی اور پانی کی فراہمی، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور بہت ساری دوسری سہولیات میسر رکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ عوام کی خاطر میں نے دن کا سکون اور رات کا آرام حرام کیا۔ میں نے جب بھی سوچا تو عوام کے بارے میں۔ پچھلے پانچ برسوں کے دوران میں جو کچھ کرسکتا تھا وہ میں نے عوام کیلیئے کیا.....'' سیاسی لیڈر کی یہ تقریر جب ختم ہوئی تو سبھی لوگ اپنے اپنے گھر چلے۔ ان لوگوں میں ایک معصوم بیچارہ غریب شخص بھی تھا اور جب وہ گھر پہنچا تو اسکی بیوی نے خلاف معمول اسکو کچھ سنجیدہ پایا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیوی نے وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا'' مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ عوام کون ہیں؟'' بیوی بھی سیدھی سادھی تھی اُسنے کہا کہ اُسے کیا معلوم؟ یہ بیچارہ سیدھا سادھا شخص بیوی سے مخاطب ہوکر بولا'' سنو، میں آج تقریر سننے گیا تھا وہاں پر میں نے سُنا کہ ہمارے لیڈر نے عوام کیلیئے بہت کچھ کیا ہے۔ اب میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ عوام کون ہے؟ وہ بار بار عوام کا نام لے رہا تھا۔ بیوی بولی ہوگا کوئی ہم تو نہیں ہیں۔ خاوند نے کہا کہ یہ تو مجھے بھی پتہ ہے کہ ہم عوام نہیں لیکن یہ عوام کون؟

سیاسی سوداگروں کا غریب اور بے سہارا لوگوں کا یہ استحصال کب تک چلتا

عوام کون؟

سیاستدانوں کی ادا اور بات کو ہر ایک سمجھ نہیں سکتا۔ وہ اپنے فن میں ماہر ہیں۔ معصوم لوگوں کو وہ اپنے شیشے میں اتارنے کا جادو رکھتے ہیں۔ انتخابات کا وقت ہو تو وہ ایمانداری، شرافت، احسان مندی، غریب پروری کا روپ دھار لیتے ہیں۔ انتخابات ختم، حذف جیت ہوئی تو اصلی روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بے ایمان، احسان فراموش، غریب دشمن اور اقرباء پروری کا مجسمہ بن جاتے ہیں۔ حیرت کی بات تو ہے کہ جب معیاد اسمبلی یا پارلیمنٹ پوری ہو کر اور نئے انتخابات کا اعلان ہوتا ہے تو وہ جس روپ میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ انکے چہرے پر پانچ سال پہلے والا مکھوٹہ دکھائی دیتا ہے۔ بے شرمی کے سارے حد پار کر کے معصوم لوگوں کو پھر سے سبز باغ دکھانے لگتے ہیں اور معصوم لوگ..... وہ تو پھر بہک جاتے ہیں کیونکہ وہ بیچارے کچھ سمجھنے سے ہی قاصر ہوتے ہیں۔

ایک واقعہ سنئے۔ جب پانچ سال کی مدت پوری کرنے کے بعد ایک سیاسی لیڈر اپنے حلقہ انتخاب میں دوبارہ الیکشن لڑنے کیلئے آیا تو اُسنے ایک عوامی جلسہ بلایا۔ ناچ گانے کا خاصا انتظام تھا اور لوگوں کو محظوظ کرنے اور جلسے میں موجود رہنے کا پورا بندوبست تھا۔ سیاسی لیڈر کی تقریر سے پہلے مقامی مولوی صاحب

نوکری چاہیئے۔ تنخواہ ملے نہ ملے!

سرکاری نوکری میں جو مزہ ہے وہ کسی اور کام میں کہاں! آپ کام کریں یا نہ کریں تنخواہ تو ملِ ہی جاتی ہے۔ جبھی تو سبھی لوگ سرکاری نوکری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پنڈت برادری کے لوگ تو اپنی بیٹی کا ہاتھ صرف اُسی شخص کے ہاتھ میں دیا کرتے تھے جو ملازم ہوتا وہ بھی سرکاری، چاہے چپراسی ہی کیوں نہ ہوتا۔ ایکطرف سرکار سے ملنے والی تنخواہ اور دوسری طرف اُوپر کی کمائی مانو کہ پانچوں انگلیاں گھی میں۔

سنا ہے کہ ایکبار ایک بیکار شخص ریاست کے ایک بڑے افسر کے پاس نوکری مانگنے گیا۔ افسر نے نوکری دینے سے اپنی معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ اُن کے محکمے میں کام کرنے والوں کی ماہانہ تنخواہ کیلیئے حکومت کے پاس فنڈس ہی نہیں ہیں اور بیچارے ملازم تین تین ماہ کے بعد تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر وہ اُسے ملازمت پر نہیں رکھ سکتا۔ لیکن بیکار و بیروزگار شخص نے منت وسماجت کی اور کہا کہ حکومت اُسے تنخواہ نہ بھی دے لیکن ملازمت دیدے۔ افسر کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس شخص نے ایک نہ سنی۔ جب افسر تنگ آ گیا تو اس نے اس شخص سے کہا کہ وہ اسے فی الحال بغیر تنخواہ ملازم بھرتی کریگا مگر اب سوال تھا کہ اُسے کونسا کام دیا جائے۔ بیکار شخص نے کہا کہ جب تک اُسے باقاعدہ تنخواہ اور کام دیا جائے تب تک وہ شخص بحیثیت سرکاری ملازم دریا میں اٹھنے والوں لہروں کی گنتی کا کام انجام دے گا۔ افسر خوشی خوشی راضی ہو کر سمجھا کہ بلا ٹل گئی۔ دو

رہیگا۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ ان سیاسی لیڈروں کی داد دینی پڑیگی یہ کسی ڈرامے، فلم یا سٹیج کے اداکار سے کچھ کم نہیں۔ کہانی اور منظر کے مطابق اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ انکے چہرے رنگ وروپ کیا کیا نت نئے منظر دکھاتے ہیں وہ سب نا قابل بیان ہے۔

لیکن افسوس ہمیں اپنے آپ پر ہے کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم پھر انکے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ ہمیں اُن لوگوں سے شکوہ نہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ انکا شیوہ ہے کہ وہ زیارتوں اور خانقاہوں کے ارد گرد گھومنے والے کبوتروں کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں جو جب کسی آدمی کو دانا ڈالتے دیکھتے ہیں تو اک دم جمع ہو جاتے ہیں اور پیٹ بھرتے ہی اڑ جاتے ہیں۔ نہ انہیں زیارت کے تقدس کے ساتھ غرض ہے نہ اس دانا ڈالنے والے شخص کے ساتھ کوئی لگاؤ۔ وہ تو بس اپنے دانا کے متوالی ہیں۔ یہ سلسلہ ہم کب سے دیکھتے آئے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر بے عقل اور نادانوں کی مائیں بچوں کو جنم نہ دیں تو عقلمندوں کے محل کیسے تعمیر ہوں گے۔ مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب لوگ ''عوام'' کا مطلب سمجھ پائیں گے تو یقیناً طاقت کا سرچشمہ بنیں گے۔

☆☆☆

تو اسکا جواب بھی نرالا تھا۔ آپ بھی سنئے ''بھائی تنخواہ دو لفظوں کا مرکب ہے۔ تن اور خواہ۔ تنخواہ سے صرف تن کی خواہش پوری ہوتی ہے من کی نہیں۔ من کی خواہش پوری کرنے کیلئے تو اُوپر کی آمدنی لازمی ہے'' جواب تو اس کا صحیح تھا لیکن.....

یہ جو اوپر کی آمدنی کہئے یا کچھ اور یہ تو رشوت ہی ہے لیکن کیا کریں ہمارے وسیع الغات میں جہاں الفاظ کا خزانہ ہے۔ وہیں سے اس رشوت کے متبادل نام نکالے گئے ہیں۔ کمیشن، فج، ہدیہ، چائے، بخشش، مٹھائی، نذرانہ اور نہ جانے کیا کیا۔ حرام خوری کی یہ لت اس قدر بڑھ گئی ہے۔ آپ سوچ رہے ہونگے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ایک سچی بات بتاتا ہوں۔ ابھی جو ملازمین ہڑتال پر تھے اور اسی دوران میں ایک گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ میرے پیچھے والی سیٹ پر دو ملازم بھائی بات کر رہے تھے۔ ''بھئی ہڑتال تو ضروری ہے کیونکہ تنخواہ بڑھے، بقایا جات ملیں گے اور نوکری میں دو سال کا اضافہ ہو جائے گا.....'' ایک ساتھی دوسرے سے کہہ رہا تھا اور دوسرے نے جواب دیا ''بھئی یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہڑتال کچھ دن اور جاری رہی ہم تو بھوکے مر جائیں گے۔ میں روز پانچ روپیہ کما ہی لیتا تھا۔ اور اُسی پر میرا گزارہ چلتا تھا۔ ورنہ تنخواہ پر کیسے گھر کے اخراجات پورے ہونگے'' یہ باتیں سنکر مجھے ایسا لگا کہ اگر سرکار ایسے ملازموں کے ہڑتال کو جاری رہنے دے گی تو یہ خود بخود ختم ہو جائیگی کیونکہ ملازم ڈیوٹی پر نہ جا کر اوپر کی کمائی سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے۔ یہ نشہ ہے اور تبھی چڑھتا ہے جب آپ بھی سرکاری ملازم ہوں۔

☆☆☆

سال گزر گئے لیکن اس شخص نے نہ تنخواہ کا تقاضہ کیا اور نہ کام مانگا۔ افسر اب سوچنے لگا۔ نہ جانے اُس شخص پر اب کیا بیت رہی ہوگی! دریافت کرنے پر اُسے پتہ چلا کہ وہ شخص اب آسودہ حال ہوگیا ہے اسکے پاس شاندار مکان ہے اور گاڑی بھی۔ کام کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص دریا کی لہروں کی گنتی کرتا ہے۔ افسر کچھ سمجھ نہ سکا اور خود اس شخص کے پاس گیا اور دیکھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

افسر نے دیکھا کہ اس شخص کے ہاتھ میں ایک کاپی اور قلم ہے اور وہ لہروں کا اندراج کر رہا ہے۔ چونکہ دریا میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلتی رہتی ہیں اور جب بھی وہ اسکے سامنے سے گزرتیں وہ انکو روکتا کیونکہ بقول اسکے کشتیوں کے تیرنے سے لہروں کی گنتی کرنے میں اُسے دقت ہوتی تھی۔ کشتی بانوں کو آگے چلنے کی مجبوری ہوتی تھی لہذا وہ گنتی شمار سرکاری ملازم کو نقدی نذرانہ دیکر آگے چلتے تھے یہ سلسلہ صبح سے شام تک چلتا رہتا تھا۔ اور گنتی شمار ملازم روپیوں سے بھری جیب لیکر گھر جاتا۔ جب آفسر نے یہ حال دیکھا تو اسکے رونگھٹے کھڑے ہوگئے۔ اس شخص کی آمدنی افسر کی آمدنی سے کہیں زیادہ تھی۔ جبھی وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص بغیر تنخواہ نوکری کیوں مانگ رہا تھا۔

یہ واقعہ صحیح ہے یا نہیں ہمیں اُس سے غرض نہیں لیکن جہاں تک دیدگی کی بات کریں سو فیصد درست ہے۔ سرکاری ملازموں کیلئے نوکری سونے کے انڈے دینے والی مرغی سے کم نہیں۔ تنخواہ تو برائے نام اصل آمدنی اُوپر کی ہے۔ جب میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ وہ اوپر کی آمدنی کے نیچے کیوں ہے

صحن میں کرسی پر براجمان تھا اور سامنے دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ میں نے علیک سلیک کیا اور دوسری طرف لگی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران دو نوجوان بھی داخل ہوئے، ایک کے ہاتھ میں ویڈیو کیمرا تھا۔ اور میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھی کو شاید کسی لوکل چینل پر اپنا تقریر نشر کروانا مطلوب ہے اور اسی کی ریکارڈنگ ہونے والی ہے۔ چونکہ میں اپنے ساتھی سے بات کرنا چاہتا تھا لہذا میں نے چینل والوں کو ریکارڈنگ کرنے کیلئے کہہ دیا۔ تو بس تقریر شروع ہوئی۔

''میرے دیش واسیو! میں کوئی پرایا نہیں بلکہ آپ میں سے ہی ہوں، کل تک آپ کی ہی طرح آپ کے ساتھ تھا اور پارٹی کیلئے ایک ورکر کی طرح کام کر رہا تھا۔ اب ہماری پارٹی کے بڑے نیتاؤں نے مجھے پارٹی سنگٹھن کا کام سنبھالنے کی ذمہ واری سونپی ہے۔ میں آپ کو آشواسن دیتا ہوں کہ میں ہمیشہ ہمیشہ آپ کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتا رہونگا۔ میں اور میری پارٹی دیش کی سرکھشا اور عام جنتا کے مسائل کو ترجیح دے گی اور اسکے لئے یوجنا بند طریقے پر کام کریگی۔ ہم آتنک واد اور ذاتی واد کو مٹا کر رہینگے اور امن وشانتی اور بھائی چارے کو ہر قیمت پر برقرار رکھیں گے.....''

اپنے ساتھی کی یہ تقریر مجھے عجیب لگی کیونکہ اردو میں شدھ ہندی کے الفاظ کے استعمال کرتے ہوئے میں نے اُسے پہلی بار دیکھا۔ ویڈیو ریکارڈنگ ختم ہوئی اور ایک ہزار روپے کا لال رنگ نوٹ چینل والوں کی جیب میں چلا گیا۔ سامنے بیٹھے تین دوسرے لوگ بھی جب چلے گئے تو میں اور میرے ساتھی کے بغیر اب وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے موقعہ غنیمت سمجھ کر اُسے پوچھا کہ یار یہ ماجرا

اور نیتا بن گئے

جب آدمی پر کسی چیز کو حاصل کرنے کا بھوت سوار ہو جاتا ہے تو وہ کسی بھی طریقے سے اِسے حاصل کرنے کیلئے کوشاں رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک بھوت سوار ہوتا تھا ہمارے ایک ساتھی کو اور وہ بھی نیتا بننے کا۔ ویسے بھی تو وہ مختلف سیاسی لیڈروں کے تلوے چاٹتا تھا اور جب بھی کبھی کہیں کوئی جلسہ ہوتا تو وہ ڈائس پر ضرور دکھائی دیتا تھا۔ دس جماعتیں بھی پاس نہ کر سکا مگر باتیں تو بڑی بڑی کرتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہم نے سُنا کہ وہ کسی غیر معروف قومی سیاسی پارٹی کا مقامی عہدہ دار بن گیا ہے۔ اتوار کی چھٹی تھی تو میں بھی اپنے اِس ساتھی سے ملنے انکے گھر گیا۔ میں نے وہاں جو دیکھا وہ قابل دید اور قابل غور تھا۔ آپ بھی سُن لیجئے۔

میرا یہ ساتھی سفید کھادی کپڑے کا کرتہ پاجامہ پہنے ہوا تھا، پاؤں میں شولا پوری جوتی، کندھے پر کریم رنگ کا کپڑا، آنکھوں پر چشمہ لگائے اپنے مکان کے

بازار سجتے ہی لُٹیرے آ گئے

سُنی سنائی بات ہے، حقیقت رب جانے۔ کہتے ہیں ایکبار کسی گاؤں میں پانی کی شدید قلت تھی۔ لوگوں نے بارہا یہ مطالبہ کیا کہ گاؤں میں ایک ٹیوب ویل کی سہولیت میسر کی جائے۔ آخر ایک انجینئر صاحب نے اپنے ترقیاتی منصوبہ میں گاؤں میں ٹیوب ویل کھودنے کیلئے ایک لاکھ روپیہ مشخص رکھوالیا۔ سال گزرا، خزانہ عامرہ سے مطلوبہ رقم بھی نکالی گئی مگر ٹیوب ویل سرے سے ہی نہیں کھودا گیا۔ جب انجینئر صاحب کا اس علاقے سے تبادلہ ہوا تو نئے انجینئر صاحب نے اپنا چارج سنبھالا۔ چارج لینے دینے کے وقت پُرانے انجینئر نے نئے انجینئر سے کہا کہ پورے کاغذات اور کام مکمل ہیں ماسوائے ایک ٹیوب ویل کے اسکی کھدائی کی رقم تو نکالی گئی ہے لیکن ٹیوب ویل کھودنا باقی رہ گیا، لہذا اس بات کو ذرا طریقے سے ہی نپٹانا۔ نئے انجینئر صاحب نے کہا کہ یہ تو معمولی سی بات ہے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نئے سال کا جب ورکس پروگرام بنا تو نئے انجینئر صاحب نے اپنے اعلیٰ افیسران کو لکھا کہ چونکہ اسے پہلے انجینئر نے فلاں گاؤں میں ایک ٹیوب ویل کھودوایا تھا لیکن 25 فٹ گہرائی پر بھی وہاں پانی نہیں ملا لہذا اُسے اور گہرا کھودنے کیلئے مزید ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ فنڈس منظور ہو گئے، لیکن زمینی سطح پر ٹیوب ویل کا کوئی نام ونشان نہیں۔

جب اس انجینئر کا بھی تبادلہ ہوا تو تیسرے انجینئر نے چارج سنبھالا۔ جانے والے انجینئر نے جاتے جاتے نئے انجینئر کو صرف یہ بتایا کہ ٹیوب ویل

کیا ہے؟ یہ لباس، یہ رنگ روپ اور ہندی سے بھرپور تقریر۔

میری باتیں سُن کر وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہ تو نیتا بننے کیلئے لازمی ہے کھادی کا لباس تو ہمارا قومی ڈریس ہے اور وہی نیتا کامیاب اور بڑا نیتا مانا جاتا ہے جو ہندی الفاظ کا بھرپور استعمال کرے۔ یہ قومی یکجہتی، قومی وفاداری، سیاسی دوراندیشی کی علامت مانی جاتی ہیں۔ خیر تم یہ نہیں سمجھو گے، یہ تو سیاسی باتیں ہیں اور یہ تو صرف نیتا لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔''

میں یہ باتیں سُن کر کم از کم تو اتنا سمجھ ہی گیا کہ نیتا بننے کے کچھ لوازمات ہیں جو میرے اس ساتھی نے بخوبی سمجھ لئے ہیں۔ چھپی نیتا بن گئے ہیں۔

☆☆☆

تیرے وعدے پر جئے ہم

تقدیر ہر حال میں مقدم ہے اور یہ ایمان کا ایک جُز ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تقدیر دعا سے بدل سکتی ہے اور کچھ لوگ یہ جانتے ہیں کہ نگاہ مردِ مومن سے بھی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مذہبی عقائد کے جو لوگ قائل نہیں وہ محنت کو تقدیر بنانے کا موجب قرار دیتے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو تقدیر کے بارے میں مختلف آراء کے باوجود ہر شخص اس جستجو میں لگا رہتا ہے کہ اسکا اقبال کسی نہ کسی طرح بلند ہو جائے اور وہ اپنے مقررہ مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ انسانی خواہشات کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ کوئی شخص امیر بننا چاہتا ہے، کوئی بڑا حاکم یا افسر بننا چاہتا ہے اور کسی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ سماج یا قوم میں مشہور ہو جائے لیکن باوجود کشمکش کے اکثر لوگ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے۔

ایسے ہی ایک شخص کو سخت چاہت تھی کہ اسکا نام پورے شہر میں مشہور ہو جائے۔ اُسنے متعدد بار کوشش کی کہ اسکا نام اخبار میں آئے اور اسکے لئے بہت سارے نت نئے طریقے اپنائے مگر ہمیشہ وہ ناکام رہا۔ جب اسکی کوئی بھی کوشش رنگ نہ لائی تو وہ بے حد افسردہ ہوا۔ وہ اپنا نام کسی بھی طرح اخبار میں دیکھنا چاہتا تھا چاہے اس کیلئے اسکی جان بھی چلی جاتی۔ آخر اُسنے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی آخری ترکیب سوجھی اور ایک روز اُسنے شہر کے چوک میں اپنے آپ کو

والا معاملہ ذرا احتیاط سے سنبھالے کیونکہ دوبارہ اسکی کھدائی کیلئے رقم نکالی گئی ہے۔لیکن ٹیوب ویل کہیں نہیں۔ نیا انجینئر تو سابقہ دو انجینئروں کا اُستاد نکلا۔ اسنے محکمہ کے اعلیٰ حکام کو ایک خط لکھا جسمیں یہ بتایا کہ چونکہ فلاں گاؤں میں دوبارہ ٹیوب ویل کی کھدائی کی گئی ہے لیکن پانی بہت گہرائی تک بھی نہیں ملا اوراب ٹیوب ویل کی جگہ گہرا کھڈا ہے جسمیں انسانی اور حیوانی جانوں کے گرنے کا خطرہ ہے۔لہذا اسکو بند کرنے کیلئے اسے مٹی کی بھرائی کرنی مطلوب ہے جس کیلئے فنڈس واگذار کئے جائیں فنڈس وگذار کئے گئے اور انجینئر صاحب کے ہاتھ بھی گرم ہوگئے اوراس طرح تین بار ایک ہی ٹیوب ویل کیلئے رقومات نکالے گئے جبکہ ٹیوب ویل کا کہیں نام نشان تک نہ تھا۔اسطرح قتل بھی ہوا اور لاش بھی غائب۔

یہی حال ہمارے یہاں ان ترقیاتی کاموں کا ہورہا ہے جن کیلئے دلی سے رقم کثیر واگذار ہوتی ہے۔اس ضمن میں دلی والے تو بے شک دل والے ہیں اور ہمارے حکام بھی تو کچھ کم نہیں۔وہ بھی یہ رقم حاصل کرنے اور بٹورنے میں پیچھے نہیں۔ابھی یہ بات سامنے آرہی ہے کہ ریاست میں مرکزی سکیم نریگا کے تحت جو رقومات نکالی گئی ہیں وہ جن کاموں کیلئے نکالی گئی ہیں ان کاموں کا کہیں وجود ہی نہیں۔مرکزی سرکاری کی ایک ٹیم نے ریاست میں نریگا اور دیگر ایسی سکیموں کے تحت دئے جانے والے مرکزی فنڈس کے استعمال پر نہ صرف انگلی اٹھائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ انکا صحیح استعمال نہیں ہوا ہے۔یہ لوٹ اب عیاں ہے جب بھی کبھی کسی سکیم کے تحت مرکزی فنڈس واگذار ہوتے ہیں تو ریاستی حکام اُسے لوٹنے کیلئے بیتاب ہوجاتے ہیں گویا بازار سجتے ہی لٹیرے آگئے۔

☆☆☆

دال میں کچھ کالا ہے

ہر بیماری کا علاج ہے لیکن شک کی بیماری لاعلاج ہے۔ شک ک بنیاد پر بہت سارے لوگوں کی زندگیاں خراب ہوگئیں، دشمنی اور عداوت پیدا ہوئی، بہت سارے معرکے ہوئے اور سب سے بڑھ کر اعتماد ختم ہوگیا۔ ہم ہر کسی عمل کو مشکوک سمجھکر اپنی اور قوم کی حیات کو جہنم بنا رہے ہیں۔ یہ رجحان نہایت ہی خطرناک اور افسوسناک ہے۔

دراصل اسکی وجوہات ہیں۔ ہمارے سامنے ہمارے سیاسی، سماجی اور دینی قائدین کا طرز عمل عیاں ہے۔ ان کے قول وفعل میں تضاد نے ان کے ہر عمل کو مشکوک بنا دیا ہے۔ جھوٹے وعدے، سبز باغ دکھانا، کرنی اور بھرنی میں فرق، حقوق العباد میں کوتاہی اور اپنے حقیر مقاصد کے حصول کیلئے نت نئے ہتھکنڈوں سے معصوم لوگوں کو پھسلانا ان قائدین کا روزمرہ کا کام بن گیا ہے۔ اُن ہی محرکات سے اعتماد کا خاتمہ اور شکوک وشبہات کا عروج وجود میں آیا۔ اب اگر کوئی شخص پرخلوص بھی ہو اور کوئی بات یا عمل خلوص کی بنیاد پر ہی کرنا چاہے لیکن لوگ

زندہ جلایا۔ سبھی لوگ اس پر حیران ہو گئے اور افسوس کرنے لگے۔ لیکن اگلے روز اسکی خودسوزی کی خبر کسی اخبار میں نہیں آئی کیونکہ اس دن سارے اخبار والے ہڑتال پر تھے اور کوئی اخبار نہیں چھپا تھا۔ بیچارے کی جان بھی چلی گئی اور آخری حسرت بھی پوری نہیں ہوئی۔ اُسے مقدر کا کھیل ہی کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے سماج میں کتنے لوگ ہیں جنکی تمنائیں، آرزویں یا خواہشات لاکھ کوششوں کرنے کے باوجود پوری نہیں ہوئیں۔ ان لوگوں کیلئے Solase کی بات ہی ہوتی ہے کہ ان کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے اُسے زیادہ انکو ملنے والا نہیں ہے۔ اسی بات پر اکتفا کر کے یہ لوگ زندگی میں مطمئین رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ عمل یا طرز فکر قابل تعریف ہے۔

لیکن ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اونچے خاندان اور امیر گھروں میں پیدا ہونے والے اکثر اپنے مقدر کے مالک ثابت ہو جاتے ہیں۔ خاندانی حکمرانی یا موروثی سرمایہ داری اسکی عام مثالیں ہیں۔ ایسا کیوں؟ شاید یہاں بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ تقدیر کا معاملہ اُوپر طے ہوتا ہے۔

چاہے بات کچھ بھی ہو لیکن ہم اس امید پر غریب یا مقدر کے غلام رہنا پسند کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ وعدہ ہے کہ جو کچھ ہمیں اس جہاں میں نہ ملا وہ آخرت میں ضرور ملیگا اور ہم بھی امیر ہوں گے ہر آرام ہمیں میسر ہوگا اور ہر چاہت پوری ہوگی۔ جبھی ہم جی رہے ہیں۔

☆☆☆

جانتے ہیں کہ اب ہم ہر اچھی اور بُری بات کو شک کے دائیرے میں لاتے ہیں۔ نتیجہ صاف ہے کہ اچھے بُرے کی تمیز ختم ہوگئی۔

اب حد تو یہ ہے کہ فطری عملوں کو بھی اسی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس سال چونکہ بارشوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ جاری ہے اور کھیتوں، ندی، نالوں اور بہت سارے پائین علاقوں میں طغیانی کی حالت دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب ہم نے اس سلسلے میں اپنے چند ہمسائیوں سے بات کرنا چاہی تو ایک تیز طرار اور تند مزاج ہمسائے نے کہا کہ آپ طغیانی کی بات کرتے ہیں یہ سب کچھ سوچی سمجھی چال کے تحت کیا جا رہا ہے۔ ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ حتا کہ اسکی یہ بات غیر شعوری تھی لیکن دوسرے سبھی لوگ یہ کہہ کر چل پڑے، ''دال میں ضرور کچھ کالا ہے''

☆☆☆

اسکو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ عمل کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو، صحیح کیوں نہ ہو، لیکن شک کی بنیاد پر وہ اس پر یا تو عمل کرنے سے احتراز کرنا چاہتا ہے۔ اس پر عمل کرنے کیلئے معاوضہ کا تقاضہ کرتا ہے۔

آپ کچھ بھی کہئے لیکن یہ حقیقت اب روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر کام اور ہر بات کا معاوضہ ایک عام سی بات ہے۔ عام لوگون کا یہ خیال ہے کہ جب بھی اُن سے کوئی کام کرنے یا کسی بات پر عمل کرنے کو کہا جاتا ہے اسکے پس پردہ ایسا کہنے والے کا ذاتی مفاد ہوتا ہے، ہر کام کیلئے پیسے دئے جاتے ہیں لہذا وہ مفت میں کیوں کوئی کام کرے ہم نے بچپن میں ایک مختصر قصہ سنا تھا جو شائد ہمارے اس رجحان کی صحیح عکاسی کرتا ہے سخت گرمی کا موسم تھا اور ایک شخص کھیت کے ایکطرف سو رہا تھا۔ وہ پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ ایک انگریز سیاح کا گزر وہاں سے ہوا تو اسنے سوئے ہوئے شخص کو جگایا اور مشورہ دیا کہ سامنے چنار کے پیڑ کے نیچے سائے میں جا کر سوئے تا کہ گرمی اور پسینے سے تھوڑی راحت ملے۔ سویا ہوا شخص جاگ کر بولا، ''ٹھیک ہے میں ادھر سایئے میں سو جاونگا آپ اسکے لئے مجھے کتنی رقم دے گیں'' یہ مختصر سی بات آجکل ہمارے ہر عمل پر صادق آتی ہے۔

لوگوں کا ماننا ہے کہ یہاں ہڑتال کرنے، ہڑتال کھولنے، پتھر مارنے، تقریر کرنے، جلسوں/جلوسوں میں شرکت کرنے، نعرے دینے سے لیکر مذہبی، سماجی اقتصادی اور دفاعی نوعیت کے سمینار، کیمپ، نمائش وغیرہ کیلئے صرف اور صرف پیسے کا دخل ہے۔ یہ کس حد تک صحیح ہے یہ تو وہی جانیں لیکن ہم تو صرف یہ

کرنے اور پانی کو پینے کے قابل بنانے کیلئے لوگوں کو کنویں سے چالیس بالٹی پانی نکالنے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ تبھی یہ پانی پینے کے قابل ہوگا۔ لوگوں سے کنویں سے چالیس بالٹی پانی نکالے لیکن بدبو وہی کی وہی رہی۔ لوگ پھر مولوی صاحب کے پاس چلے اور بتایا کہ انہوں نے چالیس بالٹی پانی نکالے لیکن کنویں کی بدبو ابھی موجود ہے۔ مولوی صاحب نے پھر ایکبار پانی کے چالیس بالٹی نکالنے کی صلاح دی اور لوگوں نے ایسا ہی کیا لیکن بے سود۔ بدبو پھر بھی دور نہ ہو سکی۔ جب ایکبار پھر لوگ مولوی صاحب کو یہ ماجرا سنانے گئے تو مولوی صاحب نے اُن سے پوچھا کہ تم نے پانی کے چالیس بالٹی دوبار نکالے لیکن کتا کہاں ہے؟ سبھی نے جواب دیا کتا تو کنویں میں ہے۔ یہ بات سن کر مولوی صاحب نے متحیرانہ نظر ڈال کر کہا ''ارے بے وقوفو تم نے تو پانی کے اسی بالٹی نکالے لیکن کتے کو وہی رکھا۔ بدبو تو کتے کی کنویں میں موجودگی سے ہے۔ تم نے آلودہ ہوئے پانی کو نکالا لیکن آلودگی وہی رکھی ہے۔ تمہیں تو پہلے کتے کو کنویں سے نکالنا تھا اور پھر آلودہ پانی کو۔'' یہ واقعہ حقیقی معنوں میں ہمارے مسائل اور ہمارے مسائل حل کرنے کے طور وطریقے کی عکاسی کرتا ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، ذاتی سطح پر یا قومی سطح پر، سیاسی ہو یا سماجی، اقتصادی ہو یا معاشرتی، ہمارا طرز عمل یہی ہے۔

جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو ہم بہت سارے مسائل میں الجھے ہیں اور لاکھ کوششوں کے باوجود ان سے چھٹکارا نہیں مل رہا ہے۔ دراصل ہم اصل مسئلے سے تو ناواقف ہیں یا اسے جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ ورنہ کوئی بھی کام نہ مشکل ہے اور نہ ناممکن، مشہور انگریزی قول ہے کہ لفظ ناممکن

یہ مسائل تصوف

دنیا میں مسائل کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے اور انسان کو ان مسائل کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے اور جب یہی انسان اس پیش آئے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام۔ اس ناکامی کا سہرا کسی خارجی شئے یا قوت کو باندھنے لگتا ہے۔ مانا کہ تقدیر مقدم ہے لیکن اکثر مشاہدے میں یہی بات آئی ہے کہ دراصل مسلہ کو سمجھنے میں یا غلطی ہوئی ہوتی ہے یا اسے حل کرنے کی کوشش صحیح طریقہ سے نہیں کی جاتی ہے۔ یہ حال جہاں افراد کا ہے وہاں یہی بات قوموں پر بھی صادق آتی ہے۔ لاکھ کوششوں اور قربانیوں کے باوجود مسلئے حل نہیں ہوتے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ بات غور طلب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایکبار ایک گاؤں میں پینے کا پانی ایک کنویں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ ایک دن اس کنویں میں ایک کتّا گر کر مر گیا۔ پانی ناپاک ہوگیا اور بدبو آنے لگی۔ لوگ ایک مولوی صاحب کے پاس چلے گئے اور اُن سے کنویں کو صاف کرنے کیلئے شرعی فیصلہ یا مشورہ دینے کی عرضداشت کی۔ مولوی صاحب نے کنویں کو اس غلاظت سے صاف

من السلویٰ

ایکبار ایک شخص کسی گاؤں میں چلا گیا۔ وہاں لوگ مختلف شکایتیں کر رہے تھے۔ کسی کو گاؤں میں انار کی فصل کو لگی بیماری کا شکوہ تھا اور کوئی لوگوں کی بے ایمانی اور جعلسازی پر نالاں تھا۔ مہمان شخص یہ سب کچھ سُن رہا تھا۔ جب سب لوگ خاموش، ہوگئے تو یہ شخص بول اُٹھا ''دیکھو ہمارے ہاں نہ انار کی بیماری کا کیڑا ہے اور نہ ہی شیطان۔ ہم ان چیزوں سے مبرا اور پاک ہیں۔'' یہ بات سُن کر وہاں موجود ایک بزرگ فوراً بول اُٹھا ''ارے بھئی تمہارے گاؤں میں انار کے پیڑ ہی نہیں ہیں تو کیڑا کہاں سے آئیگا۔ رہی بات شیطان کی وہ تو وہیں جاتا ہے جہاں ایمان ہو، آپکے گاؤں میں ایمان موجود ہی نہیں شیطان کا وہاں کیا کام ہے۔'' یہ بات تو ویسے بھی عام فہم ہے کہ چور وہاں جاتا ہے جہاں مال ہو، جہاں مال ہی نہ ہو تو وہاں چور کیا کرنے جائیگا۔

یہ بات سو فیصد ہمارے ان افسران اور ارباب اقتدار پر صادق آتی ہے جو اپنی ایمانداری کا ڈنڈورا پیٹتے تھکتے نہیں جبکہ حقیقت میں انہیں ایسے مواقع نہیں ملتے جہاں سے وہ اپنی جیبیں گرم کرتے۔ ورنہ ہماری اس پیرواری میں یہ

(impossible) خود کہہ رہا ہے کہ میں ممکن ہو یعنی "I M Possible" ہر مسئلے کے اندر ہی اسکا حل پوشیدہ ہے شرط ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ مسئلے کو نہ جاننا یا اسکی طرف آنکھ بند رکھنا کسی بھی طرح مسئلے کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ کاش ہم اپنی زندگیوں میں مسئلے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تا کہ انکا حل نکل آئے اور اسی طرح کتنا اچھا ہوتا اگر ہمارے سیاسی، سماجی اور قومی دانشور ہمیں درپیش مسائل کی تہہ تلک پہنچنے کی کارگر کوشش کرتے اور امن وشانتی اور آزادی عزت ونفس کے حصول کیلئے کوشاں ہوتے۔ تو ان مسائل کو حل کرنا مشکل نہیں لیکن اس کیلئے علامہ اقبالؒ کے درس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

☆☆☆

سرحد کے اُس پار سے۔ ابھی اسی سرما میں دلی سے ونٹر سکولنگ (Winter schooling) کے نام 600 کروڑ کی رقم من السلویٰ کے مانند نازل ہوئی۔ گیارہ دن سکول جو چلے تو اُوپر والا بھی مدد کرتا ہے ہماری۔ کہتے ہیں ہمتِ مردان مدد خدا۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دلی سے آئے خزانے کو کیسے ہضم کیا جائے جبھی اوپر والے نے برفباری کر کے ہماری مدد فرمائی۔ ویسے بھی بقول تعلیمی حکام گیارہ دن میں ہمارے بچوں نے چھ ماہ کا سیلبس پورا کیا تھا لہذا اگر سکول پھر بند بھی ہوئے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوا۔

یہ سب دیکھکر میں آجکل اوپر والے سے یہی مانگتا ہوں کہ کوئی ایسی سبیل نکالے کہ میں بھی اپنی شان بڑھا سکوں۔ ہمارے آنگن میں انار کا پیڑ اُگا دے۔ پھر دیکھنا۔ آپ کو بھی پتہ چلیگا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ ''نریگا، آتما، ونٹر سکولنگ،، بازآبادکاری، امن وامان قائم کرنے، چھٹیاں منانے وغیرہ کے نام پر کتنے قسم کے من السلویٰ نازل ہوئے، میرے رب اب ایک ایسا من السلویٰ نازل فرما دے جو صرف اور صرف مجھے نصیب ہو'' یہ دعا اب وردِ زبان ہے میری۔ آپ ہنسئے مت، وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا میرے بارے میں سوچ رہے ہیں

کیا پوچھتے ہو حال میرے سنسار کا
افسانہ لکھ رہا ہوں دلِ بے قرار کا

☆☆☆

کیسے ممکن ہے کہ کوئی بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھولے۔ دو دو ہاتھوں سے لوٹنا تو آپ نے بھی سُنا ہوگا لیکن کیا کبھی آپ نے اسپر غور کیا ہے کہ دو دو ہاتھوں سے لوٹنا کیا ہوتا ہے۔ بھئی۔ آپ کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اپنے دائیں بائیں ذرا نظر ڈالئے۔ جس کسی کو موقع ملتا ہے وہ ایک ہاتھ سے سرکاری خزانے کو دوسرے ہاتھ سے سرکار کی رعایا کو لوٹنے لگتا ہے۔ یقین نہیں تو ذرا یاد کیجئے جب سرکار نے لوگوں کو ووٹر کارڈ دینے کا حکمنامہ جاری کیا اور اسکے لئے مخصوص سرکاری اہل کاروں کے ذریعے فوٹو اٹھانے کیلئے شاید بیس روپیہ دینے کا اعلان بھی ببانگ دُہل کیا۔ لیکن پھر کیا ہوا، کسی کو یہ بیس روپے نہ ملے بلکہ ووٹر کارڈ حاصل کرنے کیلئے ووٹر کو اپنی جیب سے پچاس روپیہ دینے پڑے اور اسے چائے، خرچہ اور کرایہ کا نام دیا گیا۔ گویا جو سرکاری اہلکار اس کام پر معمور تھے انہوں نے سرکاری خزانے سے بیس روپے اور عام لوگوں سے پچاس پچاس روپیہ حاصل کر کے لاکھوں روپیوں سے اپنی جیبیں بھر دیں۔ یہ تو ایک مثال ہے ایسی تو سیکنڈوں کیا ہزاروں مثالیں ہماری نظروں میں ہیں لیکن کیا کریں؟ یہ تو من السلویٰ ہے۔

یہ سب دیکھکر ہم بھی کبھی کبھی سوچنے لگتے ہیں کہ ہمیں یہ جیب بھرنے کا موقع کیسے اور کب ملیگا؟ سُننے میں تو رشوت نہیں لیتا ہوں لیکن جب سے میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالنی شروع کی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی شان وشوکت اور ٹھاٹھ دیکھے، ہمارا دل بھی..... دل ہی تو ہے اور ہم بشر ہی ہیں۔ ویسے بھی ہمارے پیرواری پر بہت سی مہربانیاں بھی نازل ہوتی ہیں، کبھی دلی سے اور کبھی

لیجئے یہاں ایک ڈاکٹر صاحب کا پرائیوٹ دواخانہ ہے۔اور بورڈ پہ لکھا ہے ''ڈاکٹر طوفان بی اے ایم ایس'' کل تک یہ صاحب بے کار تھے اور سڑکوں کی خاک چھانتے تھے، لیکن آج ڈاکٹر ہیں۔سب کہتے ہیں کہ اُنہوں نے آلٹرنیٹیو میڈیسن میں ڈگری حاصل کی ہے کب کہاں اور کیسے یہ تو ایک معمہ ہے۔اور حقیقت یہی ہے کہ وہ ڈاکٹر ہے اور بیماروں کا علاج کر رہا ہے۔

یہ صاحب ایک ہائیر سیکنڈری میں لیکچرر بھی ہیں اور اُردو پڑھاتے ہیں بیسویں صدی کی آخری دہائی کے فضل و کرم سے دس سے سولہ تک کی ساری جماعتیں بیرونی امداد سے درجہِ اول میں پاس کیں ورنہ ابھی بھی اپنے مرحوم والد کی طرح مستری کا کام کر رہا ہوتا۔خیر خیر مذکورہ دہائی تو پورے کشمیر کیلئے بلا محنت امتحانات پاس کرنے کا سنہری موقعہ لے کے آتی تھی۔اور اسکی بدولت کشمیر میں شرحِ خواندگی آسمان کو چھونے لگی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے سروشکھشا ابھیان والے اسکو اپنی جھولی میں ڈالتے ہیں۔خیر بات تو لیکچرر صاحب کی اُردو پڑھانے کی ہے۔ایک روز کلاس میں کسی طالب علم نے اُن سے پوچھا ''سر ! آئے بہار کو ہم بانٹ لیں'' کا کیا مطلب ہے۔لیکچرر صاحب کو طالب علم کے سوال پُوچھنے کے اَنداز سے کچھ اور ہی لگا۔باہر نکل کر دوسرے لیکچرر سے شعر کے معنی پوچھے وہ لیکچرر بھی بڑا شاطر تھا اور اُسے اپنے اس ساتھی کی قابلیت کا پورا اَندازہ تھا۔اُس نے اُسی اَنداز میں معنی سمجھایا۔لیکچر صاحب واپس کلاس میں آگئے اور سوال پوچھنے والے طالب علم سے مخاطب ہوا ''سُنو میں بتاتا ہوں تمہیں شعر کا مطلب۔یہ شعر دراَصل بھارت کی ایک ریاست بہار کے

اَن پڑھ گریجویٹ

اَن پڑھ گریجویٹ ..... آپ چونکئے مت! مانا کہ گریجویٹ اَن پڑھ نہیں ہوسکتا لیکن یہ اختراع میری اپنی نہیں بلکہ ہماری ریاست کے ایک مشہور قابل اور ذہین سیاستدان کی ہے جو بے چارہ اپنی حاضر جوابی، تند مزاجی اور طنزیہ کلام کی وجہ سے ہی مات کھا گیا۔ سُننے میں آیا ہے کہ جب سیاستدان بقول اُنکے لمبی مُدت کی سیاسی آوارہ گردی کے بعد یاروں کی رجسٹرڈ کمپنی سے خارج ہوا تو وہ سچ بولنے لگا۔ اسکے خارج کرنے میں ملوث اسکے کچھ ساتھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے تھے۔ انہی ساتھیوں کے بارے میں ایک تقریر کے دوران اس سیاستدان نے انہیں ان پڑھ گریجویٹ کا خطاب دیا تھا۔ خیر اب وہ سیاستدان اس عالم میں نہیں ہے اور نہ ہمیں اس بارے میں کچھ کہنا ہے۔ ہمیں صرف اسکے ذہنی اختراع کے الفاظ سے غرض ہے۔ یہ آج سے پہلے تیس سال کی بات ہے۔

اگر آج ہم اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائیں گے تو ہمیں بہت سارے اَن پڑھ گریجویٹ دکھائی دیں گے۔ جب ہم آپکو ان میں سے چند ایک سے ملاقات کروائیں گے تو آپ چونکنا بند کریں گے اور ہماری بات پر لبیک کہیں گے۔ آپ ہر پیشہ اور ہر جگہ ان لوگوں کے درشن کر سکتے ہیں۔

ہم نے سُنا تم بھی سُنو

وادی میں ہڑتالوں، مظاہروں، کرفیو، بندشیوں اور مار دھاڑ کا جو سلسلہ سال رواں کے ماہ جون سے شروع ہوا تھا لگتا ہے کہ بہت حد تک تھم گیا ہے۔ اس مزاحمت سے ہم نے سیاسی طور کیا پایا اور کیا کھویا، ہم اس پر بحث نہیں کرینگے۔ البتہ یہ بات ضرور کہیں گے کہ مسلہ کشمیر کے مستقل حل پر سب متفق ہوئے اور اس ضمن میں انٹرلا کیوٹرس کی نامزدگی اور ٹریک ٹو ڈپلومیسی قدم اول ہے۔ اسکے بغیر سُننے میں آیا ہے کہ کچھ اور ہو رہا ہے مگر ہمیں نہیں معلوم گویا کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔

خیر پچھلے چھ ماہ کے دوران تجارتی حلقے کو اربوں کا نقصان ہوا اور ٹرانسپورٹرز اور دیگر کاروباری لوگوں کی اقتصادی حالت ناگفتہ بیہ بنی۔ طلباء و طالبات کی پڑھائی بھی متاثر ہوئی اور سب سے بڑھ کر بہت ساری معصوم جانیں چلی گئیں۔ اب دکانیں بھی کھل گئیں، تجارت پھر شروع ہوگئی۔ سڑکوں پر گاڑیاں رواں دواں ہیں، سکول، کالج کھلے، امتحانات بھی ہوئے اور حالات سدھرنے لگے۔ سب کچھ پہلے جیسا ہے لیکن وہ معصوم چہرے کہیں نہیں جو ہم سے بچھڑ گئے۔ کیا انہیں بھلایا جا سکتا ہے؟ ہم اگر بھولیں بھی لیکن ان کے والدین، بھائی بہن اور یار دوست کیسے بھُلا سکتے ہیں۔

لیکن..... دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جب پوری وادی جل رہی تھی تب کچھ

بارے میں کہا گیا ہے اور یہ تب کی بات ہے جب وہاں بہار کو دو حصوں میں یعنی بہار اور جھارکھنڈ میں تقسیم کرنے کیلئے ایجیٹیشن چل رہی تھی اور بہار کو بانٹنے کی مہم جاری تھی اسی پس منظر میں یہ شعر کہا گیا ہے۔'' جناب لیکچرر صاحب کی شعر کی تشریح سے ہی آپکو اُس کی گریجویشن کا اندازہ ہوا ہوگا۔

ایسی سینکڑوں مثالیں آپکو ملیں گی۔ ہمارے یہاں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں بڑی بڑی ڈگریاں ہیں اور خود کو افلاطون زمانہ سمجھتے ہیں لیکن جب کبھی بل مشافہ اُن سے ملاقات ہوتی ہے تو ڈگریاں کیا اُن کا ہر رنگ ڈھنگ مشکوک لگتا ہے۔ لیکن کیا کریں وہ تو کچھ اور ہی کہتے ہیں اور ہر ہنر، فن، قابلیت، ذہانت، ادب اور شاعری کو ڈگریوں کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ ان صاحبان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ علم ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ بڑی بڑی ڈگریاں پا کر بھی انسان اَن پڑھ رہ سکتا ہے۔ اور ڈگریوں کے بغیر بھی لوگ عالم، ادیب اور شاعر ہو سکتے ہیں۔ ؎

شاعری کوالیفیکیشن کی اگر محتاج ہے
حضرت غالبؔ کے سر پر کیوں ادب کا تاج ہے

☆☆☆

جھنڈے کا فنڈا

لو جی سُنو ! بھارتیہ جنتا پارٹی کے یووا مورچہ نے 26ء جنوری کو سرینگر کے لالچوک میں ترنگا پھیلانے کا شوشہ کھڑا کر کے اپنے نیتاؤں کو اخباروں کی سرخیاں بنانے میں ایک اہم کردار ادا کر کے اہل کشمیر کو یاد دلایا کہ 1990ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے اس وقت کے صدر مرلی منوہر جوشی 26 جنوری کو سرینگر کے لالچوک میں ترنگا پھیلانے کیلئے اُٹھے تھے. اور پھر جھنڈا لہرانے کی رسم جوشی نے کیسے پوری کی وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

سیاستدان اور انکی سیاست کب کونسی کروٹ لیتی ہے اسکے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ رنگ بدلنا زبان بدلنی اور اصول بدلنے اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رہی جھنڈے کی سیاست، یہ ایک عجیب حربہ ہے سیاستدانوں کے پاس جھنڈا لہرانا ہو یا اُتارنا، اس سب کے پیچھے ان کے سیاسی

نامور تاجررات کے تاریک سناٹوں میں اپنے کاروبار کو چار چاند لگانے میں مشغول تھے۔ خود مقرر کردہ نرخوں پر لاکھوں کی تجارت تاریکی میں کرنے والے یہ تاجر تب بھی موج منا رہے تھے اور آج بھی۔ جنگل سمگروں نے پچھلے چھ ماہ میں راتوں رات جنگلوں کا صفایا کر کے خوب کمایا رہے۔ ملازم اور وہ بھی سرکاری، ان کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ گھر بیٹھے بیٹھے تنخواہ، اسے بڑھ کر کیا؟ سرکار برائے نام اور ہڑتال برائے کام تھا۔ اور عقل محولب بام۔

آپ ناراض مت ہو جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ سچ کڑوا ہے لیکن کیا کریں کہنا تو پڑتا ہے۔ کیا اب تمام فریقین کشمیر کو سیاسی مسئلہ نہیں مانتے تو کیا سچ کی جیت نہیں ہوئی۔ لہذا میری کوئی خطا نہیں۔ پھر بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ذرا صبر کیجئے، ایک بات بتا دوں کسی سے کہنا نہیں، میں نے حال حال ہی سُنا کہ سردی اور چلہ کلاں کے پیش نظر فی الحال کوئی ہڑتال وغیرہ نہیں ہوگی۔ ہاتھوں میں پتھر اُٹھانے سے ٹھنڈ لگتی ہے۔ موسم ذرا ٹھیک ہونے دیجئے، ہم خون کا بدلہ ضرور لینگے لیکن جون میں۔ تب مزہ بھی ہے اور آرام بھی۔ نہ ٹھنڈ اور نہ زیادہ گرمی۔ آج ہڑتال کرئینگے تو کیا فائیدہ، سکول بھی بند ہیں، دفتر تو جموں چلے گئے، چوتھائی کشمیری بھی جموں میں بیٹھے ہیں، کاروبار ویسے بھی پھیکا ہے، بجلی کا نام نہیں، تو ہڑتال کیوں؟ جون میں سب کچھ جوبن پر ہوگا تبھی مزا آئیگا ہڑتال کرنے میں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ

پچھلے برس یہ خوف تھا تجھ سے بچھڑ نہ جاؤں
اب کی برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو

☆☆☆

چوک پر جھنڈا لہرانے کے درپے ہیں۔

بی جے پی نے لال چوک سرینگر میں جھنڈا لہرانے کی وکالت ایسے زور وشور سے کی جیسے پچھلی ساٹھ دہائیوں سے پوری ریاست جموں وکشمیر میں ضلعی صدر مقامات، پولیس، سیکورٹی فورسز کے مراکز اور سرکاری اداروں میں یہ ترنگا کبھی پھیلایا ہی نہیں گیا ہے۔ یہ بات بحث طلب نہیں کہ یہ جھنڈا کون اور کیسے لہراتے ہیں مگر سوال یہ ہے کیا اسے زمینی حقائق پر کوئی اثر پڑتا ہے؟

حالانکہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ لالچوک میں جھنڈا لہرانا کوئی ملکی مفاد پورا نہیں کرسکتا ہے۔ بلکہ اسکے پیچھے بی جے پی والوں کا ذاتی مفاد کارفرما ہے۔

☆☆☆

مقاصد اور اعتراض پوشیدہ ہوتے ہیں۔اس میں وطن پرستی اور قومیت کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔اور یہ صرف اپنے مقاصد اور مفاد کو پورا کرنے کا ایک حربہ ہوتا ہے۔

ویسے ہم کشمیریوں کیلئے جھنڈے کی سیاست کا اثر ہولناک ہے۔یہ جھنڈے والے دن ہمارے لئے مختلف مشکلات اور تکالیف لے کے آتے ہیں۔اب تو یہاں لوگ جھنڈوں، جھنڈے والوں اور جھنڈے لہرانے کے دنوں سے تنگ آچکے ہیں۔جوں جوں یہ جھنڈے والے دن قریب آجاتے ہیں۔توں توں تلاشیوں ،گرفتاریوں اور بندھشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔منٹوں کا سفر گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا سفر دنوں میں کیسے تبدیل ہوتا ہے یہ ہر ایک جانتا ہے۔ چھٹی یعنی تعطیل عام اور ہڑتال کا عجیب سنگم جھنڈے لہرانے والے دن ہی ہوتا ہے۔جبھی لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔یہ تو دوسری بات ہے کہ جھنڈا لہرانے کی تقریب میں سرکاری ملازموں اور کارندوں کی لازمی موجودگی پر لیڈر حضرات بھاشن دے ہی دیتے ہیں۔

یہ جھنڈے والی سیاست ہمارے خطہ ارض کشمیر تک ہی محدود نہیں بلکہ پورے بھارت میں اسکا بول بالا ہے اور اسکا مختلف موقعوں پر سیاسی، مذہبی اور علاقائی بنیادوں پر استحصال کیا جاتا ہے۔اس سے کتنا خون خرابہ ہوتا ہے! کتنے لوگ بے گھر ہوتے ہیں! کتنے لوگوں کی روزی روٹی چھن جاتی ہے! کتنے بے گناہ اور معصوم جانیں تلف ہوتی ہیں! ان سب باتوں سے یہ جھنڈے لہرانے والے با خبر ضرور ہیں لیکن انکی انہیں پرواہ نہیں۔دنیا کی ترقی یافتہ قومیں چاند تاروں پر جھنڈے گاڑنے میں مصروف ہیں اور ہمارے یہ نیتا کبھی بابری مسجد اور کبھی لال

مختلف باتیں ظاہر کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص جھوٹ کی سرحد پار کرتا ہے تو پھر اس شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گولے برسا رہا ہے۔ اسی طرح کسی کو چڑانے کیلئے اسکے نام کے ساتھ گولہ کا لفظ جوڑا جاتا ہے یعنی Nickname ۔ گولوں کے ان مختلف اقسام میں ہم اپنا روایتی گولہ ہی بھول گئے یعنی برف کا گولہ۔ کیا شاندار گولہ جسے دیکھنے کے لئے ملک اور ملک سے باہر بھی لوگ وادی میں آتے ہیں۔ لیکن ہمارے دوسرے گولوں کی گھن گرج میں یہ گولہ اپنی شناخت اور آواز سے محروم ہو گیا ہے۔ دراصل گھر کی مرغی دال برابر ہے ہم اپنے برف کے گولے کو پہنچان نہیں سکے۔ اب جو تازہ خبر ہے وہ یہی ہے کہ اب ایک نیا گولہ وارِدِ کشمیر ہو رہا۔ مرچ گولہ۔ اصل میں یہ گولہ تو ٹیئر گیس کی جگہ لے رہا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں مرچ ڈال کر اب سرکار احتجاجوں اور مظاہروں کو منتشر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ کہاں تک کامیاب ہوگا وہ تو اللہ جانے۔ کیا یہ صحیح ترکیب ہے یا نہیں اس پر ہم بات نہیں کرینگے۔ ہاں ایک بات کے لئے سرکار پولیس اور وہ لوگ جنہوں نے اس کو مرچ گولے کا نام دیا ہے قابلِ داد ہیں۔ کیا نام چُنا ہے اتنا تو پتہ چل ہی گیا کہ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ ہماری وادی میں ''گولوں'' کا ہی بول بالا ہے۔ کم از کم راج کرنے والے یہ بات تو جان گئے ورنہ ساٹھ سال سے وہ کچھ بھی سمجھنے یا جاننے سے قاصر رہے ہیں۔ ہماری وادی اور اسکے اندر رہنے والے لوگوں کو ''گولوں'' کے ساتھ شاید جنم جنم کا رشتہ ہے تبھی کوئی نہ کوئی گولہ یہاں چلتا ہی ہے۔ ہمارے اخبارات ریڈیو، ٹی وی، بازار، مسجد ہر جگہ گولوں کا ذکر ہوتا ہے۔ جب ہم نے بغور اس معاملے کی

بنگولے سے مرچ گولے تک

حال ہی وادی کے اکثر اخباروں میں یہ خبر آئی کہ ریاست میں امن وامان قائم رکھنے اور کسی بھی مزاحمتی ایجیٹیشن کو روکنے کیلئے کروڑوں روپیہ کے مرچ گولے خریدے گئے ہیں جواب پولیس محکمے کے سپرد کئے جارہے ہیں تاکہ وقتِ ضرورت کام آئیں۔ ویسے بھی ہماری ریاست بالعموم اور وادی بالخصوص مختلف قسم کے گولوں سے پہلے ہی آشنا ہے۔ ہماری ہر تحریک ہر جشن، ہر ایجیٹیشن ، شادی بیاہ کی تقریبات اور دوسرے ایسے موقعوں پر بنگولوں کا استعمال ایک روایتی عمل ہے۔ لیکن بنگولوں کا یہ استعمال اور سفر یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ آگے چل کر یہ ہتھ گولے، رتھ گولے، آنسوں لانے والے گولے وغیرہ کی شکل لیتے ہیں پھر ان کے کارنامے لاجواب۔ ویسے ریاست سے باہر بھی بنگولوں کا استعمال ہوتا ہے اور بنگولوں کے بغیر جن گولوں کا وہاں استعمال ہوتا ہے وہ ہمارے گولوں کی طرح ہیبتناک، خطرناک اور جان لیوا نہیں ہوتے۔ وہ گولے میٹھے، لزیز اور زندگی بخش ہوتے ہیں۔ سمجھے نہیں؟ بھئی میں رس گولوں کی بات کرتا ہوں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی قسمت۔ ہماری قسمت میں کڑوے گولے ہیں اور ان کی قسمت میں میٹھے گولے۔ ہماری وادی گلپوش میں ویسے بھی ''گولے'' کا لفظ مختلف اوقات پر

قوم کے غم میں کھاتے ہیں ڈنر

شادیوں کا موسم آج جوبن پر ہے۔ ہفتے کے دن جب ہم گھر پہنچتے ہیں تو ضرور دو تین دعوتی کارڈ پہلے ہی گھر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ پہلے یہ بہت اچھا لگتا تھا لیکن اب نہیں۔ وجہ صاف ہے ایک تو ہفتے میں سرکاری کام کاج سے ایک دن کی چھٹی ملتی ہے اور اُسی دن اکثر و بیشتر یہ شادیاں مقرر ہوئی ہوتی ہے دوسری وجہ اسے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ مطلب جیب پر بوجھ۔ اب تو عام نوٹ نہیں چلتے اب تو ان موقعوں پر سرخ اور سبز نوٹ ہی چلتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں شادی یا دعوت سے دوُر رہنے کے بہانے بھی ملتے ہیں۔ شادی یا دعوت سے دور رہنے کے حال ہی میں ہمارے ایک ہمسایہ کی بیٹی کی شادی تھی۔ بڑی پیاری اور شرم و حیا کی پتلی۔ لیکن ہم اِس وجہ سے اس شادی میں شرکت نہ کر سکے کیونکہ پچھلے کچھ برسوں سے وہ واہ واہ کانفرنس سے وابستہ ہیں اور ہم آوارہ کانفرنس سے۔ اس بناء پر ہم نے ان سے ترکِ تعلقات کئے ہیں۔ آنا جانا اور بات کرنا بند، شادی بیاہ اور خیر و شر کے موقعہ کی ماشاءاللہ تو بات ہی نہیں۔

تہہ تک جانے کی کوشش کی تو ہمیں پتہ چلا کہ دراصل یہ گولوں کی بات نہیں، اصل میں ہمارا لفظ گ اور غ سے قریبی رشتہ ہے اور ان الفاظ سے ہم باالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طریقے سے منسلک ہیں یہ دونوں لفظ بولنے میں ایک جیسے ہیں اور انگریزی میں دونوں کیلئے لفظ "G" کا استعمال ہوتا ہے۔ ہمارا اردگرد، ہمارا ماحول اور خود ہم اس لفظ "G" سے جُڑے ہوئے ہیں۔ خود سوچئے لفظ گ سے گات، گاؤ، گالی، گام، گانجا، گاؤں، گرانٹ، گرج، گرداب، گرفتاری، گریڈ، گوشت، اور غ سے غنڈہ، غلامی، غارت، غافل، غائب، غربت، غرق آب، غلیہ، غفلت، غم، غیبت، غیرت وغیرہ یہ الفاظ یہاں زبان زد ہیں اور تبھی ہمارے راجے مہاراجے نے بھی ہماری تعمیر و ترقی اور عزت و آبرو کی بلندیوں پر پُہنچانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بنگولے سے ہمیں مرچ گولے سے آشنا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا خوب! لیکن اُسے کیا معلوم کہ باشندگان وادی گلپوش کا مرچ سے پُرانہ یارانہ ہے ہم لوگ دنیا بھر میں سب سے زیادہ مرچی والے سالن استعمال کرتے ہیں اور تبھی یہاں کی مرچ پیداوار ہی غائب ہوگئی ہے۔ ڈر کے مارے اب یہ مرچی گولہ۔ یہ بیچارہ ناحق مارا جائیگا۔

☆☆☆

وازہ وان کے ہر ایٹم کو ہضم کر رہے تھے اور کشمیر کو ہر معاملہ میں خود کفیل بنانے کی باتیں کر رہے تھے۔ گوشتابہ کا گولہ جب داخلِ شکم ہوا تو طشت برداروں نے مجلس کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ حاضرین میں ایک زندہ دل میری حرکات کو بھانپ رہا تھا اسنے میر کے نزدیک آکر، قائدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسی کو کہتے ہیں قوم کے غم میں کھاتے ہیں ڈنر۔

میں تو یہ بات سمجھ گیا تھا لیکن افسوس اپنے آپ پر کر رہا تھا اور بار بار یہ شعر مجھے کوس رہا تھا۔

خدایا تیرے سادہ لوح بندے جائیں تو کدھر جائیں
یہ درویشی بھی عیاری ہے اور سلطانی بھی عیاری

☆☆☆

اب کل ہی ہمارے ایک دفتری دوست کے بھائی کی شادی تھی ۔ جانا تو ضروری تھا، ایک وجہ یہ کہ دفتر کا ساتھی ۔ دوسری وجہ ہم دونوں مالِ مفت کے برابر شریک ہیں اور سب سے بڑی بات وہ بھی میری طرح آوارہ کانفرنس کا ہمدرد ہے۔ شادی پر ہم گئے تو وہاں ہمیں ہمارے دوست نے اپنے نئے سمبھدیوں کے ہاں نکاح خوانوں کے ساتھ پہلے ہی روانہ کیا۔ یہ تو عزت افزائی تھی لہذا ہم نا کیسے کر سکتے۔ جہاں ہمیں جانا تھا وہ نزدیک ہی رہتے تھے اور ہمارے دوست کے پہلے سے ہی رشتہ دار اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس گھر کا خاندار آوارہ کانفرنس کا خاصا کھڈ دار بھی تھا۔ خیر ہم گاڑی میں سوار ہو کے بطرف منزل روانہ ہوئے۔ جونہی ہم دیوان خانے میں بیٹھے تو آوارہ کانفرنس کا ہمارا بڑا لیڈر مولانا طوفانی بھی اندر آ گیا۔ میں بہت خوش ہوا کہ شرفِ ملاقات ہوا۔ دوسرے ہی لمحے واہ واہ کانفرنس کے قائد شاہ امر بھی دیوان خانے میں بشانہ جم داخل ہوا۔ دونوں مولانا طوفانی اور شاہ امر نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور بیٹھ گئے۔ نکاح خوانی ہوئی، مہر کیا مقرر ہو گیا؟ نکاح خوان وکلاء اور شاہد وکلاء نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں۔ ہم صرف اور صرف قائدین قوم کو دیکھتے رہے۔

دسترخوان بچھایا گیا اور وازہ وان کی محفل آراستہ ہوئی۔ چاول دہرہ دون کا باسمتی، گوشت دلی والا، سبزی پنجاب کی، دہی گجرات کا، پانی دلی کا، کوکا کولا بھی باہر کا، صابن ہریانہ کی اور رومال جیٹ ائرویز کی۔ ہمارے قوم کے دونوں قائدین بڑے آرام سے ضیافت کا مزہ لے رہے تھے۔ دونوں بیچ بیچ میں باتیں بھی کر رہے تھے اور آزادی واٹانومی کے یہ پیامبر بڑے چاؤ سے پانی سے لیکر

تنظیم کا کارکن تھا اور نہ ہی سرکاری یا غیر سرکاری..... سے منسلک تھا۔ خیر سچائی سامنے آگئی، گاؤں والوں کو نجات ملی مگر مرغیوں کا صفایا ہونے کے بعد۔ ابھی پچھلے سال ہی عمہ شرمال پھر گاؤں میں نظر آیا تھا۔ اب وہ کیا کام کرتا ہے اور اسکا پیشہ کیا ہے، کسی کو نہیں معلوم، ہاں اتنا تو پتہ چلا تھا کہ وادی سے باہر اسکا ایک مفت راشن کارڈ ہے اور کچھ وظیفہ بھی ملتا ہے۔ اب جو پنچایتی الیکشن کا بگل بج گیا تو عمہ شرمال بھی میدان میں کود پڑا۔ مقابلہ تھا ہمارے ڈاکٹر صاحب سے۔ ڈاکٹر صاحب تو ویسے نہ پی ایچ ڈی والے ڈاکٹر ہیں اور نہ ایم بی بی ایس والے۔ مگر ہیں ڈاکٹر وہ اسلئے کہ وہ میڈیکل شاپ چلاتے ہیں اور گاؤں میں وہ بچے بوڑھوں مرد، عورتوں سبھی کے ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ویسے ہر ایک کو یہی اُمید تھی کہ ڈاکٹر صاحب سرپنچ کا الیکشن آسانی سے ووٹوں کی باری اکثریت کے ساتھ جیتیں گے۔ مقابلے میں بھی عمہ شرمال تھا جو گاؤں والوں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن کیا کہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آیا جب ووٹ شماری ہوئی تو اعلان ہوا کہ عمہ شرمال نے ڈاکٹر صاحب کو ہرا کر سرپنچ کا الیکشن جیتا ہے۔ خیر عمہ شرمال سرپنچ بن گیا تو اسکی چال ہی بدل گئی۔ ابھی کل کی ہی بات ہے۔ بتا رہا تھا کہ اب سرکاری خزانے کی پوری رقومات اسکے ہاتھوں پاس ہونگی۔ ایم ایل اے اور پارلیمنٹ ممبر اب کسی کام کے نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اب گورنر اور وزیر اعلیٰ کے بعد سارے اختیارات کا مالک عمہ شرمال ہی ہے۔ جب میں نے عمہ شرمال سے پوچھا کہ اب جو اتنے اختیارات اسکو ملنے والے ہیں وہ سب سے پہلے کیا کام کرنا چاہئے گا۔ عمہ شرمال فوراً بول پڑا ''مجھے سب سے پہلے ان لوگوں کو چن چن

جیت گیا عمہ شرمال

حال ہی میں ہوئے پنچایتی انتخابات کے نتائج جب سامنے آئے تو بہت ساری جگہوں پر وہ چونکا دینے والے تھے۔ جہاں پڑھے لکھے، سمجھداری کا دعویٰ کرنے والے بہت سارے لوگ چِت ہوگئے وہیں پر بہت سے ان پڑھ، جاہل اور غیر موزوں سمجھے گئے / قسم کے لوگ میدان مار گئے۔ ہمارے گاؤں میں بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے کو مِلا۔ تیس چالیس سال پرانا ہمارا نانوائی 'عمہ شرمال' بھی سرپنچ بن بیٹھا۔ ویسے عمہ شرمال تو بڑا چالاک، چاپلوس اور تگڈم باز ہے۔ جب کمانڈروں کا راج تھا تو خود ساختہ ایریا کمانڈر بن گیا تھا اور نانوائی کی دکان بند کر کے لوگوں پر رعب جمانے لگا تھا۔ اُن دنوں ہمارے گاؤں میں کشمیری نسل کی مرغیاں ہر گھر میں ہوا کرتی تھیں۔ خدا کا غضب ہوا کہ عمہ شرمال کمانڈر بن گیا اور جس گھر میں وارد ہو جاتا، مرغیوں کی شامت آجاتی، جبھی آج ہمارے گاؤں میں کسی گھر میں مرغیاں نہیں ہیں۔ عمہ شرمال نے پورے گاؤں والوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہر کمال راز وال تو فطری تقاضہ ہے۔ ایکبار کوئی دوسرا کمانڈر ہمارے گاؤں آیا اور جب اُسنے عمہ شرمال کے کمانڈر ہونے کی بات سُنی تو وہ حیران ہوگیا۔ اسنے عمہ شرمال کو بلاوا بھیجا، مجال تھی عمہ شرمال آتا، وہ تو رفو چکر ہو گیا۔ پورے گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ عمہ شرمال نہ کسی بندوقی اور نہ کسی ہڑتالی

اور آوٹ

کل شام کی ہی بات ہے کہ میں جب دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد گھر پہنچا تو گھر کے اندر بچوں بڑوں سب کا شور تھا۔ کچن کا دروازہ کھولا تو دیکھتا ہوں کہ گھر کے سبھی افراد ٹی وی کے سامنے بیٹھے عالمی ورلڈ کرکٹ کپ کا کوئی میچ دیکھ رہے ہیں۔ افراد خانہ دو حصوں میں بٹے تھے۔ ایک چوکوں اور چھکوں پر زور زور کی تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا اور دوسرا گروپ آوٹ ہونے پر خوشیوں سے جھوم رہا تھا۔ میرے دوازہ کھولنے پر کسی کی نظر ٹی وی سے نہیں ہٹی یوں سمجھئے کہ مجھے نظر انداز ہی کیا گیا۔ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ دروازہ بند کر کے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا اور کپڑے بدل کر بیٹھ گیا۔ شام کا وقت اور وہ بھی سردیوں میں..... کسی کو یہ خیال تک نہ ہوا کہ مجھے کانگری کی ضرورت ہے نہ ماں اور نہ ماں کے لالوں کو میری پرواہ ہوئی۔ خیر میں نے جان بچاو مہم کے تحت پھر کچن کا رُخ کیا اور کانگڑی طلب کی۔ بیگم نے شائد از راہ انصاف کانگڑی میرے ہاتھ میں تھما دی لیکن اسکی نظر..... وہ بدستور ٹی وی پر ٹکی تھی۔ جسم کے درجہ حرارت کو ذرا بڑھا کر میں نے غنیمت سمجھا کہ بارگاہ الٰہی میں سر بہ سجود ہو جاؤں۔ مگر

کر سبق سکھانا ہے جنہوں نے مجھے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ میں پولیس کو ہدایت دیدونگا کی انکی ہڈی پسلی ایک کردے'' عمہ شرمال کے تیور دیکھ کر میں نے بڑی نرمی سے پوچھا کہ وہ تو کسی دوسرے کمانڈر کی وجہ سے گاؤں چھوڑ گیا تھا اُس میں گاؤں کا کوئی شخص شامل نہیں تھا۔ عمہ شرمال کے نتھنے پھولنے لگے'' مجھے سب پتہ ہے کہ کون کون سے گاؤں والے اس میں شامل تھے اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تمہارا بھی اس میں ہاتھ تھا۔ اب دیکھ آگے کیا گل کھلاتا ہوں۔ اسے سرپنچ کی چال بولتے ہیں۔ عمہ شرمال کی باتیں دھمکی آمیز تھیں۔ مجھے خود اپنے آپ پر اور گاؤں پر افسوس ہو رہا تھا جنہوں نے عمہ شرمال کو ووٹ دئے اور اسے سرپنچ بنایا۔ ویسے اس میں ہماری غلطی نہیں تھی، ہمیں تو اسنے منت سماجت کی تھی اور کہا تھا کہ وہ اب بیکار ہے اور اسنے اپنی زندگی میں سدھار لایا ہے اب اگر وہ سرپنچ بن جائے تو اسے ماہوار تنخواہ ملے گی اور اسکا گزارہ ہوگا۔ گاؤں والوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ڈھونگ ہے خصلت کہاں بدلتی ہے۔ عمہ شرمال تو عمہ شرمال ہی رہا اور ہم گاؤں والے جو عمہ شرمال کی سرپنچی سے مالا مال ہونے کی سوچ رہے تھے اُلٹا وبال میں پھنس گئے۔ اب سنا ہے کہ ولی عہد نے فرمان جاری کیا ہے کہ سرپنچوں کو اختیارات نہیں سونپے جائیں گے۔ ہم خوش ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ وہ دن کبھی نہ آئے جب عمہ شرمال باکمال ہو جائے ورنہ ہمارا کیا حال ہوگا۔ خدا جانے۔

☆☆☆

دوسرے چینل پر اچھے پروگرام دیکھو۔ جب میں نے چینل تبدیل کر کے دوسرے چینل لگانے شروع کی تو پہلی چینل پر ''گھیلا لائیو'' دوسری پر ''مسز نتدولکر'' تیسری پر ''شادی تین کروڑ کی'' چوتھی پر ''تاراچند کا الٹا چشمہ'' اور اس طرح کسی بھی چینل پر وہ ''اچھا'' پروگرام نہ تھا جس کا اعلان میں نے کیا تھا۔

خیر میں نے بڑے نرم لہجے سے بیگم سے گذارش کی اب بھوک ستانے لگی ہے لہذا از راہ کرم کھانا پروسا جائے۔ میرے اس طرح کی التجا نے بیگم کے دل کو موم کر دیا۔ دستر خوان بچھایا گیا اور برتن ڈالے گئے۔ جب کھانا پروسنے کی باری آئی تو بیگم کے ہاتھ رُک گئے۔ کیوں بیگم کیا بات ہے؟ جب میں نے پوچھا ''چھوٹا اٹھ کے ماں کے پاس چلا گیا۔ ابّو۔ ماں کھانا پکانا بھول گئی ہے'' میں نے ایک آہ بھری سانس لی اور چھوٹو نے پھر ٹی وی پر کرکٹ چینل لگائی اور پھر سب لوگ ٹی وی کے سامنے چپک گئے اور پھر وہی شور وغل اور آوٹ

لیکن میں..... میں تو پہلے ہی آوٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دوران نماز جب میرے کانوں تک کچن کی آوازیں اور شور وغل پہنچتا تو سجدہ سہو واجب ہونا تو لازمی بن جاتا۔ خیر نمازیں دن بھر کی کیا شائد اُسے بھی زیادہ ادا کیں کیونکہ حساب میں بول چوک تو ان حالات میں ہونی ہی تھی۔ رات کے دس پھر ساڑے دس اور جب گیارہ بھی بج گئے تو نہ مجھے کسی نے چائے پلائی اور نہ ہی کھانے کیلئے کسی نے بات کی۔ آخر آدمی دن بھر محنت ومشقت تو صرف پیٹ بھر نے کیلئے کرتا ہے۔ جب بھوک نے بھی حد پار کی تو میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا۔ پھر کیا تھا؟ غصہ میں کچن کا دروازہ لات مار کر کھولا اور سارے افراد خانہ پر اپنا غصہ نکالا۔ اور یہاں نہ کسی کو اُسے کانگڑی دینے کی فکر ہے۔ نہ چائے پلانے کی۔ رات کے گیارہ بھی بج گئے تب بھی کھانا کھانے کا نام نہیں۔ کیا رکھا ہے ان میچوں میں؟ یہ کرکٹ کھیلنے والے کروڑوں روپیہ کماتے ہیں اور عام لوگوں کو بیکار بنا دیتے ہیں۔ تمہیں کیا، مفت کی روٹیاں جو ملتی ہیں، میں تو لگا ہوں نا کمانے میں۔ میں نے ٹی وی کو بند کیا اور میرا یہ رُوپ دیکھ کر سب لوگ خاموش رہے جیسے سکتہ طاری ہو۔ چونکہ طبیعتاً مجھے غصہ کرنے کی عادت نہیں لیکن آج جب تمام حدیں پار ہوئیں تو مجبوراً طبیعت بدلنی پڑی، بیگم خاموش سنتی رہی کس کی کیا مجال تھی کہ مجھ سے آنکھیں ملاتا ماسوائے چھوٹا..... اس نے ٹی وی کا رموٹ لا کے مجھے دیا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ شائد میرا غصہ حد سے زیادہ تھا۔ حالات کو سدھارنے اور قابو میں لانے کیلئے کچھ کرنا چاہئے کہیں قہر کی آندھی یہاں تک نہ پہنچے۔ میں نے رموٹ سے ٹی وی آن کیا اور یہ کہکر چینل بدلی کہ کرکٹ کے بغیر بھی ٹی وی پر اچھے پروگرام ہوتے ہیں اور اگر ٹی وی دیکھنا ہی ہو تو

ہر اچھا کام اپنے نام کر دینا ہمارے ہاں کی پرانی ریت ہے۔لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کا ہر رنگ اپنے میاں نے لایا ہے۔تو جس مصیبت اور جن مشکلات میں ہم پچھلے کئی دہائیوں سے پھنسے ہوئے ہیں، ان کے لانے والے کون ہیں۔سبز کپڑا، پاکستانی نمک، تین سوستر، رائے شماری، انتیس پندرہ، پیس بریگیڈ، گوگہ، شوگہ، آزادی، اندرونی خودمختاری، سیلف رول، تقسیم ریاست، اکھنڈ ریاست، ایریا کمانڈر، مخبر، اخوانی، مجاہد، فائیرنگ، کریک ڈاون، خون خرابا، معصوم ہلاکتیں، پیس کانفرنس، کشمیر کانفرنس، مصالحیت، اٹوٹ انگ، عارضی الحاق، شہہ رگ، سرتاج اور بل آخر سب کا اب تک حاصل صفر۔ یہ سب کس کی دین ہے۔ مانا ہمارا مزاج مستقل نہیں۔ہم باتوں کو اکثر بھول جاتے ہیں اور کبھی کبھی ہم سے بھی دانستہ یا نادانستہ طور غلطیاں ہوتی ہیں مگر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ خودغرض سیاستدان اور مفاد پرست ہماری اسی طبیعت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۱۹۸۸ء کا واقع ہے کہ ریاست کے سابق صدر اور ڈوگرہ راج کے آخری جانشین ڈاکٹر کرن سنگھ جنوبی کشمیر کے ایک ہسپتال کا اچانک معائینہ کرنے کیلئے آئے، شائد ان دنوں وہ مرکزی وزیر صحت تھے۔کشمیری قوم نے ڈوگرہ راج کے خاتمے کیلئے بہت سی قربانیاں دی تھیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے۔آپ یہ سُن کر حیران ہونگے کہ جب اسی ڈوگرہ شاہی کے وارث کرن سنگھ کو ہسپتال آتے ہوئے لوگوں نے دیکھا تو انہوں نے آو دیکھا اور نہ تاؤ اور لگانے لگے نعرے:

"تم کشمیر کے راجے ہو یہ کشمیر تمہارا ہے"

اب اس سوچ اور اس طرز عمل کو کیا کہیئے؟ دراصل ہم اور ہماری قیادت کی

یہ رنگ بھی لایا میاں.....

بیسویں صدی کی ستر اسی دہائی کی بات ہے کہ جب ریاست میں منی بسوں اور میٹاڈوروں کی فوج سڑکوں پر چلنے لگی تو اس وقت ایک ریاستی وزیر نے جلسہ عام میں اپنی سرکار اور اپنے لیڈر کے سر یہ سہرا باندھا اور نعرہ لگایا ''سڑکوں پر شور ہے ہر طرف میٹاڈور ہے..... کشمیر کا زور ہے'' ہر نئی چیز یا کام کو اپنے کھاتے میں ڈالنا سیاستدانوں کا معمول ہے، اور کبھی کبھی ایسے کرتے کرتے وہ ایسی حماقتیں بھی کر بیٹھتے ہیں کہ جنکی نظیر نہیں ملتی۔ سُنا ہے جب ایکبار کسی گاؤں میں فائر بریگیڈ کا سٹیشن کھولا گیا تو رسم افتتاح پر ایک سینئر ریاستی وزیر نے گاؤں میں فائر سروسز سٹیشن لانے کا پورا کریڈیٹ اپنے آپ کو دیا اور ساتھ ہی تقریب میں جمع ہوئے لوگوں سے کہا کہ اُسنے اپنا وعدہ پورا کیا اور اب اسکی یہی دُعا ہے کہ خدا کرے کہ یہ جلد آپکے کام آئے۔ تب تک گاؤں میں کبھی بھی آگ نہیں لگی تھی لیکن وزیر موصوف کی دعا کے وقت شائد ساعت حسن تھا تبھی دوسرے ہی ہفتے آدھا گاؤں نذر آتش ہوا۔

شاعر اور شاعری

ادبی محفلوں کا انعقاد کوئی نئی بات نہیں لیکن گذشتہ کچھ مہینوں سے جیسے ان محفلوں کے انعقاد کا ہر کسی کو بخار چڑھ گیا ہے۔ اخبارات اور جریدوں کے اجراء، سالگرہ، کتابوں کی رسم رونمائی اور نہ جانے کیا کیا۔ ویسے تو ایسی محفلیں ادب کی خدمت کا ذریعہ ہیں لیکن ان محفلوں میں کیا کچھ ہوتا ہے اور کون سے لوگ ان میں صف اول میں نظر آتے ہیں، ان سے ان کے اغراض و مقاصد پر بہت سارے سوالات اٹھتے ہیں۔ ان محفلوں کا یقیناً ایک تفریحی پہلو بھی ہوتا ہے لیکن تفریح اگر محض نفس پرستی اور جھوٹی شان بن جائے تو.....

ان محفلوں میں آپکو ایسے لوگ ملیں گے جو شاعر اور ادیب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس پر ماشاء اللہ ہماری جرأت نہیں کہ ہم کوئی اعتراض کریں۔ مگر حیرت اور حسرت تب ہوتی ہے جب یہ اصحاب اپنے آپ کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں گویا وہاں مرزا غالبؔ اور میر تقی میرؔ بھی ہیچ ہیں۔ اپنے آپ کو عظیم شاعر اور ادیب سمجھنے والے یہ لوگ نجانے کس دنیا میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ان

سوچ اور طرز عمل پر ایک سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ جیسی قوم ویسی قیادت۔ ہم ہی اسمبلی الیکشن میں بائیکاٹ کی بات کرتے ہیں اور ہم ہی ستر سے اسی فیصد شرح تک پنچایتی انتخابات میں ووٹ ڈالتے ہیں۔ یہی تضاد ہماری قیادت کی سوچ اور طرز عمل میں تب دکھائی دیتا ہے جب وہ کسی کو گندی نالی کا کیڑا کہتے ہیں اور پھر اسی کیڑے کو دوسرے مرحلے پر اپنا ساتھی اور غمخوار اور خیر خواہ بتاتے ہیں۔ برابر اُسی طرح جسطرح ایکبار سنگ بازی کو تحریک حریت کا حصہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسری بار اسے تحریک مخالف اور غیر شرعی عمل کہا جاتا ہے۔

اب آپ ہی بتائے یہ رنگ کس نے لایا ہے؟

☆☆☆

کو سمجھ لیا اور ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا اور یہ سب کچھ میں ایسے ہی کہہ رہا تھا۔

دراصل ہمارے اردگرد اور ہمارے ساتھ بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو شاعر اور ادیب ہو سکتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو جس قدر و منزلت اور status پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بعید از عقل ہے۔ اُن کی وجہ سے مشاعرے، مشاعرے نہیں رہے بلکہ پگڑیاں اچھالنے اور خود شناسی کیلئے لائسنس بن گئے ہیں۔ ادب سے نابلد یہ لوگ ادب کے نام پر کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ سب کچھ صحیح اور جائز مان کر ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنے آپکو استاد زمانہ کہنے والے یہ شعراء مرزا غالب اور میر تقی میر جیسے بلند پایہ شاعروں کو بھی اپنے شاگردوں میں ہی گنواتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بُلوا دے لیکن اُن کی ان حرکات سے کہیں اُن کے شاعر یا ادیب ہونے کا تو کیا ادب نواز ہونا بھی مشکوک نظر آتا ہے۔ اب ان لوگوں کو سمجھائے تو سمجھائے کون؟ ہم تو نہ شاعر ہیں اور نہ ادیب۔ ہاں اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو میری یہی گذارش ہے کہ آپ ضرور کیجئے اور پھر ہمیں بھی بتائے۔

☆☆☆

کے سامنے مرزا غالبؔ جیسے عظیم شاعر کی بات کرتے ہیں تو وہ نہ معلوم کیوں ناک چڑھاتے ہیں..... ویسے غالبؔ کو تو انہیں شاعر ماننے پر اعتراض نہیں لیکن اپنے آپکو.....

ابھی کچھ دن پہلے میرے ایک ساتھی نے ایک ایسے ہی شاعر اور ادیب کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ہمارے اس ساتھی کو ادب و شاعری سے لگاؤ ہے لیکن وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ شاعر یا ادیب ہیں۔ انکا ایک دوست بڑا شاعر اور استادِ ادب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اکثر بیشتر ہمارے اس ساتھی کو ادبی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایک روز ہمارے اس ساتھی نے دیوان غالبؔ سے کچھ اشعار لکھ کر اپنے اس استادِ ادب کو یہ کہہ کر دکھائے کہ اُسنے یہ اشعار خود لکھے ہیں۔ شاعر صاحب نے ایک نظر اشعار پر ڈالی اور دوسری نظر ہمارے ساتھی کے چہرے پر ''بھئی، تمہیں کتنی بار میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ شاعری ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم اپنے بزنس کو ہی سنبھالو تو اچھا رہیگا۔ یہ الفاظ کہہ کر ہمارے اس معزز شاعر نے اپنی جیب سے سُرخ سیاہی والا قلم نکالا اور ان اشعار کی درستی کرنے لگا۔ ''یہ بھی کوئی شاعری ہے، یہاں وزن نہیں، قافیہ کا خیال نہیں، شعر میں تسلسل نہیں، یہ تو واہیات ہے'' جب یہ شاعر صاحب اپنی زبان سے کلمات پر کلمات سناتے گئے تو میرے ساتھی کو یہ برداشت نہ ہوسکا اور اُسنے ایکدم تکیہ کے پیچھے رکھی ہوئی دیوان غالبؔ سے وہ ورق کھولا اور شاعر صاحب کو دکھا کر بتایا کہ ارے جناب یہ اشعار جنکی تم درستی کرنے لگے ہو میرے اپنے نہیں بلکہ یہ مرزا غالبؔ کے اشعار ہیں۔ شاعر صاحب نے موقعہ کی نزاکت

کچھ حصہ نہیں تھا تو ہم بھی پریشان ہو گئے۔ سوچنے لگے کہ اتنے بڑھے گھوٹالے! اور ہمیں کانوں کان تک خبر نہیں۔ ہمارے لوگ پیچھے کیسے رہ گئے۔ ابھی ہم پچھلے دو تین ماہ سے اسی سوچ میں تھے کہ ہمارے لوگ کیا اب ایماندار ہو گئے ہیں یا انہوں نے اتنا کچھ کمایا ہے کہ اب اور کمانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمارے سارے خدشات تب دور ہوئے جب ہم نے ''چینی سکینڈل'' کا نام سُنا۔ محکمہ امور صارفین میں ابھی ابھی سنسنی خیز کھانڈ سکینڈل کا انکشاف ہوا ہے۔ پولیس کو کروڑوں روپے کے اس سکینڈل کی تحقیقات کے دوران ٹھوس شواہد موصول ہوئے ہیں۔ خرد برد کی اس سازش کی جڑیں بہت گہری بتائی جاتی ہیں۔ سرکاری کھانڈ کی عدم دستیابی کی شکایت کوئی نئی بات نہیں۔ سرکاری کھانڈ کہاں جاتا ہے یہ بات کسی سے چھپی نہیں۔ ہمارے اعلیٰ سرکاری حکام، ٹریڈ یونین لیڈر اور بڑے کاروباری لوگ اس لوٹ اور گھپلے میں ملوث ہیں۔ خیر مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ سوچ رہیں ہونگے کہ آج میں کیوں سنجیدہ باتیں کرنے لگا ہوں۔ بھئی سنجیدہ نہ ہو جاؤں تو کیا کروں؟ یقین مانئے، اللہ شاہد ہے کہ پچھلے پانچ برسوں سے میں سرکاری کھانڈ حاصل کرنے کیلئے تڑپ رہا ہوں۔ یہ لوگ پہلے راشن کھا گئے، پھر کھانڈ اور آگے پتہ نہیں کہ کیا ہوگا.....؟ تیل خاکی پہلے ہی غائب ہے۔ بی پی ایل راشن اور اَنتودیا کا استحصال جاری ہے۔ نریگا کے تحت لوٹ جاری ہے۔ باقی جو کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی۔ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اُس کی نظر صرف اور صرف مال کمانے پر ہے۔ وہ کوئی بھی طریقہ اپنا کر، چاہئے صحیح یا غلط۔ مال کماؤ بھیک مانگ کر، چھین کر یا چوری کر کے، لیکن کماؤ۔ یہ ہمارا نصب العین

ہم کسی سے کم نہیں

ہماری ریاست کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہم ملک کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کئی شعبوں میں آگے ہیں اور ہمارے کارنامے دکھانے کے قابل ہیں۔ یہ رشوت خوری کا شعبہ ہو یا سرکاری خزانے کی لوٹ کا معاملہ، ہڑتالیں ہوں یا سرکاری ملازمین کی غیر حاضری، بجلی چوری ہو یا کوئی اور معاملہ، سرکاری زمین ہڑپ کرنے کا سکینڈل ہو یا راشن کا گھپلا، ہم ہر معاملے میں آگے آگے ہیں۔ ہمارے کارنامے بینظیر ہیں۔

اب جبکہ مرکزی سطح پر وہاں کے ''عقلمند، ذی ہوش اور وسیع النظر'' سیاستدانوں نے ہماری ریاست کے ان معاملات پر نظر ڈالی تو انہوں نے سوچا کہ وہ کیوں پیچھے رہیں۔ ویسے بھی ریاست بہار ''چارہ گھوٹالہ'' کی وجہ سے دوڑ میں شامل ہو چکی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ نہلے پہ دہلا۔ ایک کے بعد ایک گھوٹالہ، ٹو جی سپکٹرم گھوٹالہ، آدرش سوسائیٹی گھوٹالہ، کامن ویلتھ گیمز گھوٹالہ اور کتنے گھوٹالے جو ابھی طشت از بام ہونے والے ہیں۔ ان گھوٹالوں میں چونکہ ہماری ریاست کا

مُتی آب

خلیل جبران کا نام آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ مشہور ادیب اور ناول نویس گذرے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک واقعہ زیر مطالعہ آیا۔ واقعہ کیا بلکہ وہ حقیقت جو آج ہم اور ہمارے سماج پر سو فیصد صادق آتی ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

ایک شہر تھا جس کے حکمران اور رعایا بہت ہی عاقل، باشعور، محنتی ایماندار، وطن پرست، باصلاحیت اور صحیح غور وفکر کے مالک تھے۔ حکومت کا کام شہر کا بادشاہ اور اسکی رانی بخوبی انجام دیتے تھے اور وہ اپنے حقوق اور فرائض سے بخوبی واقف تھے اور یہی انداز اور یہی طرز رعایا کا بھی تھا۔ نہ کہیں جھگڑا، نہ کوئی شورش، نہ کوئی بدنظمی اور نہ ہی کوئی ایسا مسئلہ۔ امن وآشتی اور انسانیت کا دور دورہ تھا۔ کہتے ہیں کہ کسی شیطانی چڑیل کو یہ بات راس نہیں آئی اور وہ یہ سوچنے لگی کہ کس طرح اس شانت بستی میں افراتفری پیدا ہو جائے۔ اسکی منحوس نظر شہر کے ان دو کنوؤں پر پڑی جن میں سے ایک کنویں سے بستی والوں کو پینے کا پانی سپلائی کیا جاتا تھا۔ جبکہ دوسرا کنواں بادشاہ اور اسکی رانی کے پانی کیلئے مخصوص تھا۔ شیطانی چڑیل نے ایک ترکیب سوچی اور پاگل ہونے کی دوائی اُس کنویں کے پانی میں ملادی جو رعایا کیلئے وقف تھا۔ جب لوگوں نے اس کنویں کا پانی استعمال کیا تو وہ سب کے سب پاگل ہوگئے اور دیوانی حرکتیں کرنے لگے۔ وہ عجیب وغریب باتیں کرنے لگے اور وہ ان غیر شعوری حرکتوں پر فخر کرنے لگے۔ بادشاہ اور رانی

بن گیا ہے۔ ہم نے لوٹ مار کر کے کمانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ ویسے بھی ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمیں ان گھٹالوں کی کیا ضرورت؟ اِس میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور یہ کارِ دارد والا معاملہ ہے۔ ارے بھئی۔ ہمارے تو نوٹ چھاپنے کی کتنی ہی مشینیں ہیں۔ مانا کہ کچھ پکڑی گئیں لیکن ابھی تو کام جاری ہے۔ ہمارا اپنا ریزرو بنک ہے۔ جتنے روپیہ چاہیں چھاپ لیں۔ ویسے بھی اصلی نقلی والے کی ہمیں پہچان کہاں؟ اور پھر رہی بات ہمارے کارناموں کی، اسے پھر یہ بات مستحکم ہوگئی کہ ہم کسی سے کم نہیں۔

☆☆☆

شاید کہ اُتر جائے دل میں میری بات

جب کسی کی زندگی میں غم کا اندھیرا چھا جائے اور ہر طرف غم ہی غم ہوں تو پھر اسکے لئے کوئی غم غم نہیں رہتا۔ یہ بات آپ نے تو سنی ہوگی۔ اب یہی بات ہماری خجالت، بے ایمانی اور جھوٹ پر صادق آتی ہے۔ ہم دُزد دلاور ہیں، چوری کرتے ہیں تو سینہ تان کے۔ کسی بھی غلط کام پر شرمندگی کا احساس نہیں گویا ہم Shame Proof بن گئے ہیں۔

آج کل ہماری ریاست کے مختلف علاقوں میں سرکار کی طرف سے نمائش اور میلے منعقد کئے جا رہے ہیں اور ان نمائشوں اور میلوں میں مختلف اداروں کی کارکردگی کی نمائش اور عکاسی کیجاتی ہے۔ حال ہی میں ہم نے بھی ایک ایسے میلے کا چکر لگایا۔ ہم نے کیا دیکھا غور طلب ہے۔ محکمہ انڈسٹریز کی طرف سے چند ملبوسات ان کے اسٹال میں لگے تھے اور اسٹال پر موجود محکمہ کے نمائندے کے مطابق یہ ملبوسات ایک مقامی صنعت کار نے تیار کئے تھے جو ریاستی محکمہ انڈسٹریز کا رجسٹر کیا ہوا یونٹ کو چلا رہا ہے۔ ملبوسات یقیناً پرکشش تھے۔ جب ہم نے انکو اچھی طرح دیکھا تو اندر سے دہلی کی ایک فرم کی لیبل تھی۔ دراصل بازار سے دہلی کا مال خرید کر اپنے اسٹال میں رکھتے وقت ان سے اسکی اصلی لیبل اٹھانے میں چُوک ہوئی تھی۔ یہ دیکھکر ہمیں محکمہ کی اس قسم کی ہاتھ کی صفائی کی داد دینی پڑی۔ پوچھنے پر محکمہ کے موجود نمائندے نے بتایا کہ دراصل مقامی صنعت کار کے پاس اپنی لیبل نہیں ہے لہذا دہلی کی لیبل لگائی ہے۔ جواب بھی کیا نرالا تھا۔

رعایا کی اس صورتحال سے پریشان ہوگئے۔ انہوں نے رعایا کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ پاگل لوگ الٹے بادشاہ اور رانی کو ہی پاگل سمجھنے لگے اور انہیں مارنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ ان کی جگہ رعایا میں سے کسی دوسرے شخص کو بادشاہ منتخب کیا جاسکے۔ جب یہ بات بادشاہ اور اسکی رانی کے کانوں تک پہنچی تو بادشاہ پریشان ہوگیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب جان کیسے بچائی جائے۔ بادشاہ کو پریشان دیکھ کر رانی نے بڑے غور وفکر کے بعد بادشاہ کو جان بچانے کی ترکیب بتائی۔

ترکیب کیا تھی؟ میں ابھی بتاتا ہوں کیونکہ اصل بات یہی ہے۔ رانی نے بادشاہ کو بتایا کہ کیوں نہ وہ بھی اُسی کنویں کا پانی پئیں جسکا پانی پی کر رعایا پاگل ہوگئی ہے تاکہ وہ بھی پاگل ہو جائیں اور پاگلوں کے بیچ رہ کر ان کی ہی جیسی حرکات کریں۔ جان بھی بچ جائیگی اور حکومت بھی رہیگی اور پھر بادشاہ اور رانی نے یہی کیا۔

ہماری موجودہ صورتحال کچھ ایسی ہی ہے۔ بے ایمانی، رشوت خوری، جعلسازی، دھوکہ دہی اور لوٹ کھسوٹ کے اس دور میں اگر کوئی ایسا فرد بشر ہے جو ان اوصاف ناگفتہ بہ سے دُور رہنا چاہتا ہے یا ابھی دور ہے اسے سماج، حکومت اور ہماری قوم ناپسندیدہ شخص قرار دیتے ہیں۔ کچھ اُسے دقیانوسی، کچھ ناکارہ، کچھ نااہل اور کچھ بے عقل کے نام سے نوازتے ہیں۔ اور جب یہی ایماندار افراد ان طعنوں کو سن کر تنگ آتے ہیں تو وہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو ہی ڈالتے ہیں اور اگر انکا ضمیر ایسا کرنے نہیں دیتا تو انکی حالت اور قسمت کا خدا ہی حافظ.....

☆☆☆

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

ہر قوم اور سماج کی ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اس قوم کے فرد اپنے قوم کے تئیں کتنے سنجیدہ اور انکا احساس ذمہ داری کس درجے کا ہے۔قوم ان کو کیا کچھ دے رہی ہے کے بجائے وہ یہ سونچیں کہ وہ قوم کو کیا کچھ دے رہے ہیں۔ ذمہ داری کا یہ احساس از خود ہر فرد میں موجود ہونا لازمی ہے۔جب ہر فرد میں قوم یا سماج کے تئیں خود وابستگی Sense of belonging ہو تو وہ قوم ترقی کے تمام تر منازل طے کر سکتی ہے اور کوئی طوفان انہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس احساس ذمہ داری اور خود وابستگی کا فقدان ہے۔ ہر شخص اپنے ذاتی فائدے کو قوم کے مجموعی مفاد سے بالاتر سمجھتا ہے اور اپنے حقیر مقصد کو پانے کیلئے قومی مقاصد کو قربان کرنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ اپنے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔اصول، قانون اور شریعت ان باتوں کو بالائے طاق رکھ کر اور انسانیت کو دقیانوسی سمجھنے والے اب ایسی باتیں کر

ویسے ہم محکمہ انڈسٹریز کے بارے میں ہی کیوں کہیں۔ یہ معاملہ تو ہر جگہ کا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ چوری، خیانت، جعلسازی پر شاباشی بھی ملتی ہے۔ اس بات سے کون واقف نہیں کہ ریاست کے جنگلات کا صفایا جس طرح پچھلی دو دہائیوں سے جاری ہے اسکی مثال نہیں۔ جنگلوں کے جنگل صاف ہو گئے اور سبز سونے کی یہ لوٹ ابھی جاری ہے لیکن بیرون ریاست کی ایک نیم سرکاری تنظیم NGO نے ہمارے محترم المقام وزیر جنگلات کو جنگلات کے تحفظ اور بچاؤ کیلئے بھارت گورو Bharat Guarav ایوارڈ سے نوازا۔ واہ رے واہ یہی نہیں اب تو ریاست کے سیاستدانوں کو نام نہاد نیم سرکاری تنظیموں سے روز ایوارڈ ملنے لگے ہیں۔ عورتوں کی عزت و آبرو کو چار چاند لگانے کیلئے محکمہ سماجی بہبود کے وزیر کو ایوارڈ ملا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسانی حقوق کے متعدد ادارے ریاست میں عورتوں کے استحصال کے بارے میں کب سے چلا رہے ہیں۔ ویسے بھی اس ریاست میں کچھ بھی ممکن ہے ہماری ہر بات ٹنل کے اس پار معنی بدلتی ہے۔ ہمارا سفید سیاہ ہو جاتا ہے۔ بدنام زمانہ 'ممہ کنہ' کو بھی راشٹر پتی کا اعلیٰ ایوارڈ ملتا ہے۔ یہ رنگ ہے نام نہاد جمہوریت کا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ ریاست کے باہر اور اندر ایسی خود ساختہ تنظیمیں موجود ہیں جو اپنے حقیر مفاد کے خاطر مختلف ذی اثر لوگوں کو ایوارڈ دیتی ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایوارڈ حاصل کرنے والے خود کیا محسوس کر رہے ہیں۔ یہ تو اللہ ہی جانے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں تو شرمندگی ہو رہی ہے۔ خود پر بھی اور اُن پر بھی۔ خود پر اسلئے کہ ہم بھی اسی سرزمین کے واسی ہیں۔

☆☆☆

تحصیلدار پریشان ہوگیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک دم اسکے دماغ میں ایک ترکیب سوجھی۔ اسنے سوئے ہوئے شخص پر ایک تیز لات ماردی اور کہا اٹھو اور میری یہ اٹیچی اٹھاؤ اور مجھے نائب صاحب کے کواٹر تک لیجاؤ۔ سویا شخص ایکدم کھڑا ہوگیا اور اٹیچی ہاتھ میں اٹھا کر کہنے لگا۔ ''اب تو لگا کہ آپ واقعی نائب صاحب ہیں۔ اب بتائے کہاں جانا ہے اور کیا حکم ہے؟ لگتا ہے کہ شائد یہی فارمولہ اب کام کا ہے جبھی ہمارے لوگ اپنا فرض اور اپنا کام سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ لاتوں کے بھوت.....

☆☆☆☆☆

رہے ہیں جو بعید از سوچ ہیں۔

افسوس تو اس بات پر ہے کہ پڑھے لکھے ملازم چپراسی سے لیکر محکمہ کے سربراہ تک اکثر لوگ مفت کی روٹی کھانے میں ہی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔ یہی حال سیاستدانوں، بیوپاریوں اور دوسرے لوگوں کا ہے۔ اب اگر کوئی انہیں اس بات کا احساس بھی دلائے تو اُسے یہ لوگ فرسودہ شخص قرار دیتے ہیں۔ ان غیر فرض شناس لوگوں پر کسی بھی بات کا اثر نہیں ہوتا گویا وہی اصول ان پر صادق آتا ہے ''ہم پرانے زمانے کے جیلر ہیں ہم بدلنے والے نہیں'' حکومت کتنے قوانین بنائے دینی علماء کتنی وعظ و نصیحت کریں، آپ کتنے ہی سمینار کریں، لیکن یہ لوگ بدلنے والے نہیں دراصل بیداری اس شخص کیلئے ہوتی ہے جو نیند میں ہو لیکن یہ شخص نیند میں سوئے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے صرف اپنی آنکھیں بند رکھی ہیں۔

میں نے ایک کہانی سنی ہے کہ ایکبار ایک نائب تحصیلدار کا تبادلہ کسی دور دراز علاقے میں ہوا۔ ہاتھ میں ایک اٹیچی لئے یہ شام کے وقت جب گاؤں پہنچا تو وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا تاکہ کسی شخص سے وہ اپنے سرکاری کوارٹر کا پتہ پوچھے۔ اسکی نظر ایک شخص پر پڑی جو ایک پیڑ تلے سو رہا تھا۔ نائب صاحب اسکے نزدیک پہنچا اور بڑے سلیقے سے اس شخص کو جگایا اور کہا ابے بھائی میں یہاں کا نائب تحصیلدار ہوں اور ابھی شہر سے آیا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے یہاں کے نائب تحصیلدار کے سرکاری کوارٹر کا راستہ بتائے۔ بڑے آئے ہو، نائب تحصیلدار بن کے، میں نے بہت سارے نائبوں کو دیکھا ہے جا اپنا راستہ ناپ۔ ناحق میری نیند خراب کر دی۔ یہ شخص بڑے خشمناک طریقے سے بولا اور پھر سو گیا۔ نائب

نوٹ ٹھگ کے ہاتھوں تھمایا اور کہا کہ اسنے دس منزلیں ہی شمار کی تھیں۔ ٹھگ چلا گیا اور خاموش اجنبی شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ بھئی ناحق دس روپیہ کا نقصان ہوا اور یہ بمبئی والا یہ تو اتنا چالاک ہے کہ ایکدم اُسنے تاڑ لیا کہ تم عمارت کی منزلیں شمار کر رہے ہو۔ دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا ''ہم بھی تو کیا کم ہیں۔ مانا بمبئی والا چالاک تھا لیکن ہم بھی چالاکی میں اسکے باپ نکلے۔ میں نے پندرہ منزلیں شمار کی تھیں اور اُسے صرف دس منزلوں کی شمار کے پیسے دئے۔ اب وہ چالاک ہے یا ہم'' دونوں اجنبی خوب ہنسے کیونکہ اپنی چالاکی پر بہت خوش تھے۔

چالاکی کا یہ تصور اور نفع ونقصان کا یہ حساب ضرور سمجھ سے بعید ہے لیکن ہمارا موجودہ حال اس سے مختلف نہیں ہے۔ اپنے آپ کو ''دانائے دہر'' سمجھنے والے ایسے لوگ ہماری قوم اور ہمارے سماج میں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ ہر بات کا اپنے من کے موافق معنی نکالنا اور پھر اسے صحیح جتلا کر دوسروں پر ٹھونسنا اب تو عام سی بات ہے۔ غیر حقیقت پسندانہ طریقہ کار اپنا کر اپنی ہر بات کو منوانا تو عزت کا سوال بن گیا ہے۔ خودغرضی بے ایمانی اور انسان دشمنی کا بول بالا ہے اور سچائی، حقیقت، ایمانداری، فرض شناسی، انسانیت کے الفاظ اب صرف ڈکشنریوں تک ہی محدود ہیں۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ ان الفاظ کا بے تحاشا استعمال سیاسی لیڈران الیکشن کے دوران اپنی تقریروں میں کیا کرتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ خودغرضی کے عالم میں ہمیں اپنے بغیر کچھ اور دکھائی نہیں دیتا اور اپنی ہر بات صحیح، اپنا ہر کام درست اور اپنا ہر عمل اچھا لگتا ہے۔ جب آدمی کی یہ حالت ہو تو

عقل پر دُھول

سُننے میں آیا ہے کہ ایکبار دو شخص بمبئی (جسے اب ممبئی کہا جاتا ہے) شہر دیکھنے گئے۔ دونوں شخص شہر سے ناواقف تھے اور پہلی بار اپنے علاقے سے نکلے تھے۔ بمبئی میں بڑی بڑی شاندار قد آور عمارتیں دیکھکر وہ حیران ہو گئے اتنی بلند عمارتیں انہوں نے پہلی بار دیکھیں تھیں۔ جبھی دونوں ساتھی ایک جگہ رُک گئے اور سامنے کھڑی ایک بلند عمارت کی منزلیں گننے لگے۔ اسی دوران ایک ٹھگ انکے پاس کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا ''یہ تم اس بلڈنگ کی طرف کیا دیکھ رہے ہیں؟'' دو اجنبی شخصوں میں سے فوراً ایک بول اُٹھا کہ وہ اُس عمارت کی منزلیں شمار کر رہا ہے۔ ٹھگ بھی تو کمال کا شاطر تھا اور اس نے پوچھا ''عمارت کی منزلیں شمار کر رہے ہو اور وہ بھی مفت۔ یہ بمبئی ہے یہاں ہر کام کے پیسے لگتے ہیں۔ بتاؤ کتنی منزلیں شمار کی ہیں اور اتنے روپے نکالو'' یہ سُن کر دونوں اجنبی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے اور اُسی پہلے والے اجنبی شخص نے اپنی جیب سے دس روپیہ کا کھرا کھرا

مداری کا تماشا

مداری کا تماشہ آپ نے دیکھا ہوگا لیکن میں نے مداری کا جو تماشہ اپنے اسکول کے ایام میں دیکھا ہے ہوسکتا وہ تھوڑا مختلف ہو۔ دوران تعلیم اسکول میں جب ریسس (Recess) کا وقفہ دیا جاتا تھا اس دوران اسکول کے بچے اکثر لنچ کیا کرتے تھے اور تب یہ لنچ فروٹ وغیرہ ہوتا تھا۔ ایک روز میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ جونہی میں اسکول گیٹ کے باہر نکلا اور اتفاقاً میری نظر وہاں لوگوں کے ایک مجمع پر پڑی۔ میں بھی اس مجمعے میں گھس گیا۔ اندر جا کے دیکھا کہ ایک آدمی ڈفلی بجا رہا تھا۔ سامنے ایک بندر تھا اور ایک ٹرنک تھوڑی دیر ڈفلی بجا کر اُسنے مجمع میں لوگوں پر نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

''مہربان، قدردان۔ میں جو آپ کے سامنے کھڑا ہوں، میں پورے ہندوستان، پاکستان، افغانستان گھوم کے آیا ہوں۔ میری زندگی تجربوں سے بھری پڑی ہے۔ مجھے آپ سے کچھ لینا نہیں ہے بس تجربے کی بات کرنی ہے۔''

اسکے بعد اس شخص نے لوگوں کو ایک دلچسپ داستان سنانی شروع کی۔

''مہربان، قدردان۔ آپ نے پرستان کا نام سُنا ہوگا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں

اسکا شعور جواب دے دیتا ہے اور اسی حالت میں وہ اپنے آپ کو دھوکہ دینے لگتا ہے۔

ہمارا حال بمبئی جانے والے اُس اجنبی سے مختلف نہیں جو ناحق دس روپے ہار کے بھی اپنی چالاکی پر فخر کر رہا ہے۔ دراصل جس طرح وہ اپنے آپ کو ہی اُلو بنا رہا ہے اسی طرح ہم بھی چالاکی کا ڈھونڈورا پیٹتے پیٹتے خود ہی اُلو بن رہے ہیں۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے ذرا سوچئے کہ جسے ہم نفع سمجھتے ہیں کیا وہ واقعی نفع ہے۔ کہیں ہمارا حساب تو غلط نہیں ہے۔ چالاکی کا کھیل کھیلتے کہیں ہم خود اُلو تو نہیں بن گئے ہیں۔ مگر افسوس ہم یہ ماننے کیلئے قطعی تیار نہیں کیونکہ ہم چالاکوں کے چالاک ہیں نا؟ ورنہ اِسے تو عقل پر دُھول ہی کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

ہاتھ میں دو تین لیکر کہنے لگا۔

''قدر دان دوستو۔ یہ وہ انمول دوائی ہے جو میری اور میرے استاد کی عمر بھر کی محنت اور تجربے کی دین ہے۔ یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ سر درد سے پیٹ درد۔ اسکی اصلی قیمت اگر لگائی جائے تو پانچ سو سے کم نہیں ہے لیکن آپ کیلئے پانچ سو نہیں، چار سو نہیں دو سو بھی نہیں ایک سو بھی نہیں صرف پانچ روپیہ، پانچ روپیہ''۔

ہاتھ میں ڈبے لیکر وہ مجمع میں موجود لوگوں کو لبا تا رہا یہاں تک کہ پچاس سو ڈبے فروخت کر دئے۔ ٹرنک خالی ہو گیا اور مداری نے اپنا سامان باندھ لیا اور چل پڑا۔

لوگ چلے گئے لیکن میں۔ میں مداری کی سنائی داستان پوری سننے کیلئے بے تاب تھا۔

اسکے بعد ہر روز ریسس کے دوران میں جب بھی سکول گیٹ کے باہر اس مداری کا مجمع دیکھتا تو فوراً جاتا تا کہ پوری کہانی سنوں لیکن مداری ہمیشہ کہانی ادھوری سناتا اور میں ہمیشہ تشنہ رہتا۔ اکثر میں یہ سوچتا کہ یہ مداری ایسا کیوں کرتا ہے لیکن سمجھنے سے قاصر رہتا۔ اب تو بہت وقت گذرا اور یہ بات اب سمجھنے لگا۔ دراصل مداری کے کہانی سنانے کا مقصد صرف لوگوں کی بھیڑ جمع کرنا ہوتا تھا ورنہ اسکا اصل کام اسکی دوائی کی ڈبیاں بیچنا ہوتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا جب لوگ وہاں موجود رہتے۔ اگر وہ کہانی مکمل کرتے تو لوگ پھر وہاں سے چلے جاتے اور مداری کا دوائی بیچنے کا کام پورا نہیں ہوتا۔ خیر اسکا یہ تو کام تھا اور تب پورے شہر میں یہی ایک مداری تھا۔

پریاں رہتی ہیں۔ ایک بار یہ پریاں گھومنے کیلئے نکلیں تو ان میں سے ایک پری جسکا نام نُور پری تھا پرستان سے دُور کہیں نکل گئی اور واپسی کا راستہ بھول گئی۔ بھٹکتے بھٹکتے وہ ایک دنیاوی شہر میں پہنچ گئی۔ شہر کے لوگوں نے جب اس خوبصورت پری کو دیکھا تو انکے ہوش اُڑ گئے۔ سب اسکے پیچھے پڑ گئے یہاں تک کہ بات بادشاہ تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نے پری کو حاضر دربار کروایا اور جب اُسنے پری کا حُسن دیکھا وہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔ بادشاہ کے ساتھ اسکا نوجوان شہزادہ بھی دربار میں موجود تھا وہ بھی دل ہی دل میں پری کو چاہنے لگا۔ بادشاہ نے پری کو شاہی مہمان کا درجہ دیکر بادشاہ محل میں رہنے کو جگہ دی اور اسکی دیکھ بال شہزادے کے سپرد کی۔ چند دنوں میں ہی بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ پری سے شادی کریگا۔ یہ سُن کر شہزادہ حیران ہوگیا اور اسکے دل میں بادشاہ کی نفرت پنپنے لگی اور اُسنے فیصلہ کیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف اعلان بغاوت کریگا اور پری کو اپنی بیگم بنائے گا۔ ادھر معاملہ یہ تھا اور اُدھر پرستان میں بادشاہ نے اعلان جاری کیا کہ جو بھی نور پری کو ڈھونڈ کر لائیگا وہ اسکی شادی اُسی کے ساتھ کریگا۔

کہانی کو یہاں تک پہنچانے کے بعد مداری رُک گیا اور بندر کی طرف دیکھکر بولا۔

''ہاں۔ ہاں۔ میں سمجھ گیا۔''

قدردان، مہربان۔ معلوم ہے کہ یہ بندر کیا کہہ رہا ہے؟ یہ بتا رہا ہے کہ ٹرنک کو کھول کر پہلے انمول تحفہ آپ لوگوں کو پیش کروں''

اسکے بعد مداری نے ٹرنک کھولا جسمیں بہت سارے چھوٹے ڈبے تھے۔

مجلسِ خرافات

کشمیر میں مشاعروں اور ادبی محفلوں کا انعقاد تو اچھی بات ہے اور اس سلسلے میں حال ہی میں بہت ساری ایسی نشستیں دیکھنے اور ان میں شرکت کرنے کا موقع مجھے بھی ملا۔ دراصل ان محفلوں میں شاعروں اور ادیبوں کی تعداد سامعین سے زیادہ ہوتی ہے لہذا ہر محفل کے منتظم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طریقے سے سامعین کی خاص تعداد جمع ہوں اور اس کوشش میں ایرے غیرے اور ادب سے نا آشنا لوگ بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں ہمارے محلّہ کے عمہ رستم نے بھی خصوصی دعوت پر شرکت کی۔ معلوم ہوا کہ عمہ رستم نے مشاعرے کیلئے چائے پانی کا انتظام کیا تھا۔ منتظم مشاعرہ نے عمہ رستم کی فراخ دلی کے عوض اُسکا تعارف ایک سخی امیر، غریب پرور اور اعلیٰ ادیب و شاعر کی حیثیت سے کیا۔ عمہ رستم بھی اپنی بے جا تعریفیں سن کر پھولے نہ سمایا اور اپنے آپ کو شاعر اور ادیب سمجھنے لگا۔

لیکن آج۔ آج ہر طرف ایسے مداریوں کی فوج ہے۔ آپ جہاں چاہیں وہاں صرف اور صرف مداری ہیں جو بڑی حسین اور خوبصورت کہانیاں سُنا کر لوگوں کی جیب ہی نہیں کاٹتے، بلکہ ان کی گردنیں کاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بھلا ہو وِکی لیکس کا جسنے بڑے بڑے مداریوں پر سے پردہ اُٹھایا۔ وہاں تو بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، سیاسی وابستگی، نظریات سب کے سب نکلے ''حمام میں ننگے'' اب نہ مجھے سکولی ایام کے مداری پر غصہ آتا ہے اور نہ ہی اب پوری کہانی سُننے کیلئے بیتاب ہوں۔ اب تو ہر راہ گذر پر مداریوں کا تماشہ ہے اور ہم ہیں جواب بھی انکے لئے جمع بنے ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

محترم فناؔ صاحب : تڑاخ تڑاخ، ٹرٹر تڑاخ، آگے پیچھے کوئی بات
رات بھر صرف خراٹے، کیا ہے نام کیا ہے ذات

محترم وباؔ صاحب : محبت وحبت کچھ نہیں، سودا بازی ہے،
تقدیر کی یہ بات ہے، کہہ گیا قاضی ہے

محترم ستم ظریفؔ : مجھے محبت تو بس ان حسینوں سے ہے
جنہیں نفرت بس پسینوں سے ہے

محترم سہراؔ صاحب : میں خیال ہوں کسی کا سوچتا کوئی اور ہے
جو کچھ پڑھ رہا ہوں لکھنے والا تو کوئی اور ہے

صدر محفل عمہ رستم صاحب : یہ تو تیرا کمال میں شاعر ہو گیا
اے زر تیرا ممنون تو عمہ بھر ہو گیا

نمونہ کلام تو آپ نے بھی پڑھا۔ اس مشاعرے کے بعد میں نے قسم کھائی کہ آیندہ کبھی کسی محفل میں نہیں جاؤں گا بلکہ میں بھی اپنی ایک ادبی تنظیم بناؤں گا۔ بس تلاش تنظیم کے نام کا ہے اور جوں ہی یہ نام ملے گا فوراً ہم بھی تشکیل تنظیم اور انعقاد مشاعرہ کرینگے۔ آپ سے بھی گذارش ہے کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے تو فوراً بتایئے ہم آپ کو مشاعرے میں شرکت کی دعوت دینگے۔

☆☆☆

محفل کے دوسرے ہی دن عمہ رستم نے فی الفور اپنی نئی ادبی تنظیم ''مجلس خرافات'' کے قیام کا اعلان کیا اور خود اس تنظیم کا سربراہ بن بیٹھا۔ یہ تو ابھی شروعات تھیں، فوراً مختلف ٹی وی چینلوں اور اخباری نمائیندوں کو دعوت پر بلایا اور انکی خاطر خواہ تواضع کی۔ ان کی جیبیں بھی گرم کیں تمام اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی چینلوں میں عمہ رستم کے مجلس خرافات کے سربراہ بننے کی خبر نمایاں تھی۔ ہم نے بھی جب یہ خبر پڑھی تو مناسب سمجھا کہ عمہ رستم سے مل کے ہی آئیں۔ اب عمہ رستم راتوں رات بدل گیا تھا، خیال بھی نئے اور ڈھال بھی نئی۔ عمہ رستم کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے اور وہ انہیں بتا رہا تھا کہ اسے بچپن سے ہی ادب اور شاعری کا شوق تھا لیکن وہ بے جا شہرت کا قائل نہیں تھا لیکن اب تو لوگواں کو پتہ چل ہی گیا کہ وہ شاعر اور ادیب ہے لہذا اب تو خلوت نشینی ترک کرنی پڑیگی..... اور اب اسنے آئندہ ہفتے پنچایت گھر میں ایک محفل مشاعرے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ خیر اسکی باتوں سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لہذا ہم نے بھی اسکی ہاں میں ہاں ملائی۔

ہفتے کا دن تھا کہ مجھے بھی محمد رستم کی مجلس خرافات کی طرف سے مشاعرے میں بحیثیت سامع کا دعوت نامہ ملا۔ دعوت نامہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ کھانے پینے کا خاطر خواہ انتظام بھی کیا گیا ہے۔ مفت کھانا چھوڑنے والوں میں سے تو کم از کم ہم نہیں اور اسی طرح مقررہ دن پر ہم بھی پنچایت گھر پہنچے۔ وہاں شامیانے اور لاوڈ سپیکر کا انتظام تھا اور مجلس میں مختلف شعراء حضرات نے جو کلام سامعین کو سُنایا اُس میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں۔

سے پوچھے کہ وہ جو کہتے ہیں صد فیصد درست ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ کوئی سرکاری کام نہ کرے۔ مفت میں مشاہرہ حاصل کرے، کیا یہ گناہ نہیں۔ لوگوں کے کام سالوں سال نہ نپٹا کر وہ کونسا فرض نبھا رہے ہیں؟ کیا اسے بہتر یہ نہیں ہوتا کہ وہ رشوت ہی لے کر ہی تھوڑا کام کر دے۔ لیکن یہ صاحب تو قوم، سماج اور سرکار میں اپنی ایمانداری کا چھاپ ڈال چکے ہیں لہذا کس کی ہمت کہ وہ ان کے سامنے مُنہ کھولے۔

اب رہا تیسرا گروپ۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو صرف رشوت لیکر ہی کام کرتے ہیں۔ انکا دین وایمان سب کچھ روپیہ ہے بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ و نسل، مرد وزن وہ ہر کسی کا کام بڑی خوشی سے کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں اور انتظار میں رہتے ہیں کہ کب انہیں یہ کام کرنے کا موقعہ ملے بشرطیکہ نقد نارائن ساتھ ہو۔ فائیل پر تھوڑا وزن رکھنا ضروری ہے جبھی فائیل کے پَر آجائینگے اور ٹیبل سے ٹیبل اڑنے لگے گی۔ ایک مہینے کا کام ایکدن میں ہو جائے گا۔ لیکن جس کے پاس زر نہ ہو یا نادے پائے اسکی فائیل کے ''پَر'' کبھی نہیں آئینگے اور عین ممکن ہے کہ فائیل ہی غائب ہو جائے۔ خیر یہ تو دستور زمانہ ہے۔ پیسہ کیا نہیں کرتا۔ باپ بڑھا نہ بھیا سب سے بڑا روپیہ۔

چوتھے قسم کے لوگ پہلے تین قسموں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ رشوت تو ضرور لیتے ہیں اور وہ بھی خاص موٹی اور ایڈوانس میں مگر کام کبھی نہیں کرتے، چاہے کوئی بھی ہو۔ پیسہ بٹورنے میں ماہر، چرب زبان، چالو اور تیز وطراق۔ یہ لوگ عجیب قسم کے خصائل کے مالک ہیں۔ کام نہ کر کے بھی کوئی ان سے تقاضہ

جو کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

ہر قوم اور سماج میں افراد ہوتے ہیں اور ان سب کی الگ الگ عادات، خصائل وشمائل ہوتی ہیں۔ایک دوسرے سے مختلف اور اگر کہیں ملتے بھی ہیں پھر بھی پوری طرح نہیں۔ہم نے بھی ایک چھوٹی سی تحقیق اس حوالے سے کی ہے۔ اُن لوگوں کے بارے میں جنکو سرکار نے مختلف عہدوں پر فائز کر کے کچھ اختیارات بھی دئے ہیں تا کہ وہ نظم ونسق اور عوامی خدمات کے کام خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ان لوگوں کی چار بڑی قسمیں ہیں۔پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو ایماندار ہیں، رشوت نہیں لیتے ہیں اور اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو ایماندار ہیں، رشوت نہیں لیتے، دفتر وقت پر آتے ہیں وقت پر جاتے ہیں لیکن کام.....کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ فائیلوں کی فائیلیں انکے ٹیبل پر پڑی رہتی ہیں۔روزان فائیلوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔کوئی بھی فائیل انکے ٹیبل سے نکلتی نہیں۔کس کی مجال کوئی ان صاحب کو کچھ کہے۔صبح دس بجے اپنے آفس چیمبر میں داخل ہو کر چار بجے سے پہلے باہر نہیں نکلتے۔کمرے میں جائے نماز رکھی ہے صرف دن میں نماز پڑھنے کیلئے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہیں۔اپنے ماتحت ملازموں اور آنے جانے والوں سے کہتے رہتے ہیں کہ رشوت لینا اور دینا دونوں گناہ ہیں اور جرم بھی۔کون صاحب ان

اسکو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

حال ہی میں سرکار کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ جن لوگوں نے پانچ سال پہلے بینکوں سے قرضہ حاصل کیا ہے اور وہ قرضہ ادا نہیں کر سکے انکا قرضہ معہ سود سرکار کی طرف سے معاف کیا جاتا ہے اور بینک یہ رقم سرکار سے وصول کرینگے۔ ایسے اعلانات اور مراعات کا اعلان اسے پہلے بھی سرکار وقتاً فوقتاً کر چکی ہے۔ گویا ان لوگوں کے وارے نیارے جو بینکوں سے لئے گئے قرضہ کو ہڑپ کر گئے اور سرکاری اعلانات ڈکار مارنے کا کام کر دیتے ہیں۔

خوب۔ بہت خوب۔ جو لوگ بڑی جانفشانی سے محنت و مشقت کر کے خون پسینہ کی کمائی سے ایک ایک کوڑی بچا کر بینک سے لئے گئے قرضہ کی ادائیگی کرتے ہیں انکو شاباشی کے بدلے حوصلہ شکنی اور جو لوگ بڑی چالاکی اور خود غرضی سے بینک سے لئے گئے قرضوں کو ہڑپ کر دیتے ہیں انکو شاباشی اور انعام۔ واہ رے واہ۔ یہ کیسی عقلمندی، سوجھ بوجھ اور فیصلہ کرنے کے طریقے اور انداز۔ سستی شہرت کے یہ اعلانات و اقدامات ملک و قوم اور افراد قوم کو کہاں لے جاتے ہیں، ان پر کبھی کسی نے سوچا بھی ہے!

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن ان اقدامات سے اچھے خاصے کام کرنے والے

نہیں کر پاتا کیونکہ یہ لوگ حاضر جواب، شاطر، زبان پلٹنے میں مِثالی ہیں۔رشوت دینے والا اگر کبھی تقاضہ کرنے کی کوشش بھی کرے اسکا کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ انکی مثال فلم ایکٹر قادر خان کے اس ڈائیلاگ سے ملتی ہے ''جنکی عزت نہیں ہوتی انکی بے عزتی نہیں ہوتی'' بے عزتی تو اسکی ہوتی ہے جسکی کوئی عزت ہو۔

ان چار اقسام میں موخرالذکر دو اقسام کے لوگوں کو راشی قرار دیکر نفرت سے دیکھا جاسکتا ہے۔پہلی قسم تو قابل تعریف ہے لیکن دوسری قسم کے لوگوں کے بارے میں دماغ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔یہ لوگ قوم اور حکومت کیلئے کسی ناسور سے کم نہیں۔کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔

☆☆☆

کونسی بلا

میرے بچپن میں ہمارے گھر ایک پٹواری کا آنا جانا تھا۔ وہ میرے مرحوم والد صاحب کا دوست تھا۔ ایک بار اچانک پانچ چھ مہینے اُسکا ہمارے گھر آنا بند ہوا اور اسکے بعد ایک دن پھر ہمارے ہاں نمودار ہوئے۔ دراصل ہوا یوں تھا کہ پٹواری کو ایک سو روپیہ رشوت لینے پر نوکری سے معطل کیا گیا تھا اور اینٹی کورپشن محکمہ میں اسکے خلاف کیس دائر کیا گیا تھا۔ اب چھ ماہ بعد اُسے بحال کر کے پھر ہمارے علاقے میں پٹواری متعین کیا گیا تھا۔ واقعہ کی تفصیلات جاننے کے بعد پتہ چلا کہ مذکورہ پٹواری نے محکمہ اینٹی کورپشن میں ایک ہزار روپیہ رشوت دیکر کیس کو خارج کروادیا تھا۔ اس کے بعد میرے ذہن میں پٹواری کا یہ قصہ ہمیشہ تازہ رہا۔

جب میری نوکری لگ گئی تو میں نے ایک روز اپنے سینیر ساتھی سے پٹواری کے اس واقعہ کا ذکر لیا۔ وہ صاحب ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ''ابھی تم چھوٹے ہو، تمہیں نہیں معلوم پٹواری کس بلا کا نام ہے؟'' اسکے بعد اُسنے مجھے ایک واقعہ

اور ایماندار لوگوں کی سوچ بھی بدل جاتی ہے۔ مالِ مفت دلِ بے رحم، مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، والے معاملے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ قرضہ لینے والا پہلے دن ہی سے اسی انتظار میں رہتا ہے کہ کب کوئی وی پی سنگھ، دیو گوڑا یا من موہن سنگھ آئے اور اسکا قرضہ معاف ہونے کا اعلان کردے۔ اُسے تو نعوذ باللہ قیامت سے پہلے امام مہدی کے آنے پر اتنا یقین نہیں ہے جتنا محکم یقین اس بات پر ہے کہ دلی والا راجہ آہی جائیگا جو اسکا قرضہ ادا کریگا اور وہ بھی سرکاری خزانے سے۔ گویا لوگوں کو نکما، کاہل، بے ایمان کمزور اور بھکاری بنا دیا ہے۔ سرکار کا کام تو یہ ہونا چاہئے کہ لوگوں کو وہ راستہ دکھائے جسے انہیں حوصلہ ملے، ہمت ملے کام کرنے کی، صلاحیت بڑے اور خود اعتمادی حاصل ہو جائے یوں لوگ خود بھی کماتے اوروں کو بھی کمانے کا راستہ دکھاتے۔ خود کھاتے اوروں کو بھی کھلاتے۔ لیکن کیا کریں ان ناعاقبت اندیش سیاستدانوں کو جو سستی سیاست اور ووٹ بنک سیاست کا کھیل کھیل کر ملک کی معشیت کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کب یہ سمجھیں گے کہ یہ قوم کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ ان اقدامات سے کن کی حوصلہ شکنی ہو رہی اور کن کی حوصلہ افزائی۔ ذرا سوچئے یہ تو ہوئی نا وہی بات اسکو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

☆☆☆

بمشکل انسان خدا کے قریب اسکے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا۔ خداوند کریم تو ہر ایک بات سے واقف ہے اور اُسنے دیکھا کہ تمام بندگان یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کونسا شخص خدا کے ساتھ بیٹھا ہے جبھی خدا نے کہا کہ یہ پٹواری ہے اور اسے میں اپنے سے دُور رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ اگر یہ میری نظروں سے دُور رہا کہیں یہ میری پوری کائینات کسی کے نام نہ کردے سمجھے برخوردار پٹواری کسے کہتے ہیں''۔ اجیت کی اس بات کا حقیقت سے تو کوئی واسطہ نہیں ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پٹواری کے اوصاف میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ وہ الف کی زمین زید کے نام اور بکر کی زمین شکر کے نام کرنے میں ماہر ہے، لاثانی ولاجواب ہے۔ اجیت کے کہنے کا مطلب تو صاف اور سیدھا تھا کہ وہ پہلگام میں خریدی ہوئی ہٹ کا مالک تب تک ہے جب تک پٹواری کا آشیرواد ہے بصورت دیگر ۳۷۰ اور نہ معلوم کس آرٹ میں میں ہٹ سے کبھی بھی دستبردار ہوسکتا ہوں۔

ابھی حال ہی میں مجھے ایسے ہی ایک پٹواری سے کام پڑا۔ اپنی زمین کا انتخاب (کاغذ) لانا مطلوب تھا۔ پٹواری نے اپنا لٹھہ نکالا اور جمعبندی رجسٹر کھول کر کہا ''یہاں پر تمہارا نام ہی نہیں ہے۔ یہ زمین تو کسی اور کے نام ہے'' میں حیران ہوگیا کہ کیسے ممکن ہے اور پٹواری سے کہا کہ یہ زمین میں نے پندرہ سال پہلے خریدی ہے اور اس پر مکان بھی تعمیر کیا اور اس مکان میں تو ہم دس سال سے رہ رہے ہیں۔ یہ تو باضابطہ کورٹ رجسٹری والی زمین ہے اور میرے پاس اسکے کاغذات ہیں۔ ''ہونگے کاغذات لیکن وہ تمہارے ہیں۔ ہمارے پاس تو سرکاری ریکارڈ ہے۔ یہاں پر تو تمہارا نام کہیں نہیں ہے۔'' پٹواری فوراً بول پڑا۔

سنایا۔ بالی ووڈ کے مشہور ایکٹر اجیت ایک زمانے کے صف اول کے ایکٹر مانے جاتے تھے۔ یہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ اکثر پہلگام آیا کرتے تھے اور انکی اکثر فلموں کی شوٹنگ وہیں ہوا کرتی تھی۔ پہلگام میں انہوں نے ایک ہٹ (Hut) خریدی تھی۔ ریاست جموں و کشمیر کا پشتنی باشندہ نہ ہوتے ہوئے یہ ہٹ انہوں نے کیسے خریدی تھی وہ دوسرا معاملہ ہے۔ ویسے یہاں ایسے ہزاروں دوسرے معاملے ہیں جن سے تو ہر ایک واقف ہے۔ خیر ان باتوں میں اُلجھنا صحت کیلئے ٹھیک نہیں اسلئے ہم اپنے ہی موضوع کے حدود میں رہ کر بات کرینگے۔ میرے اس سینیر ساتھی نے بتایا کہ ایک روز اجیت بمبئی سے آکر سیدھے پہلگام کے نزدیک ایک گاؤں میں گیا اور وہاں کسی گھر میں گیا۔ میرا یہ سینیر ساتھی بھی اُس گاؤں میں چلا گیا تا کہ اجیت کے درشن ہو جائیں۔ پتہ چلا کہ دراصل اجیت گاؤں میں مقیم پٹواری کے گھر بمبئی سے لائی ہوئی مٹھائی لیکر گیا تھا۔ پٹواری کے گھر کے باہر لوگوں کی بھاری بھیڑ تھی جو اجیت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اجیت اندر گھاس کی چٹائی پر ستو کے ساتھ نمکین چائے پی رہا تھا۔

میرے سینیر ساتھی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک ماہ بعد اسنے ایسے تیسے کر کے اجیت سے رابطہ قائم کر ہی لیا اور ایک بار موقعہ پا کر اجیت سے پٹواری والی بات چھیڑی۔ اجیت نے خوب ہنسی لگائی اور کہا ''برخوردار۔ یہ پٹواری ہے نا تم نہیں جانتے یہ کیا بلا ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ جب ایکبار خدا نے اپنے پورے بندوں کو اپنے سامنے لایا تو سب باادب احترام اور رب ذوالجلال کی عظمت کے تعیں سَر جھکائے کھڑے ہوئے۔ لیکن ایک بندہ

مجھے بھی غصہ آیا لیکن کیا کرتا؟ ایکدم تحتِ شعور سے ''پٹواری'' کے بارے سُنے سُنائے واقعات ابھرنے لگے۔ اور پٹواری سے کہنے لگا کہ اب وہ ہی کوئی راستہ بتا دے تاکہ میرا نام سرکاری کاغذات میں درج ہو جائے۔ پٹواری ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ ویسے تو بڑا مشکل کام ہے لیکن تم تو پریشان ہو۔ کچھ سوچنا ہی پڑیگا۔ تم فی الحال دس ہزار روپیہ دیدو باقی میں کام کرنے کے بعد لونگا۔ تمہارا کام کسی نہ کسی طریقے سے کر ہی دینگے۔ آخر تم بھی کسی سے کم نہیں۔ جیب سے دس ہزار روپیہ نکالے اور اس بات کا ذاتی علم آج ہی ہوا کہ پٹواری کونسی بلا ہے۔''

☆☆☆

KHURAFAAT

(DR. M SHAFI AYAAZ)

تصنیفات

تلاش سحر (اردو شاعری)

شبِ تنہائی (اردو شاعری)

تم یاد کرو گے (اردو شاعری)

برستے ہی نہیں بادل (اردو شاعری)

شام ہونے لگی (اردو شاعری)

دردِ پنہاں (اردو افسانہ)

پگڈنڈی کا مسافر (اردو افسانے)

فیصلہ ابھی باقی ہے (اردو افسانے)

آدھے ادھورے لوگ (اردو افسانے)

پوٚت ژھائے (کشمیری شاعری)

ہدیہ عقیدت (کشمیری حمد و نعت)

ییلہِ زٕ زُرژاو (کشمیری افسانہ)

اسلامک بینکنگ (انگریزی مقالہ)

خرافات (اردو انشائیے)

پیر کی گلی کے اُس پار سفرنامہ (زیرِ طباعت)

ZZZ Publications

IZHAR MUBASHIR (9906663269)
izharmubashir@gmail.com